مقالات

امام احمد رضا

اور

مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار

پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین
و
پروفیسر ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم

تقدیم پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد

اِدارہ تحقیقاتِ امام احمد رضا (رجسٹرڈ) کراچی

امام احمد رضا

اور

مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار

پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین

و

پروفیسر ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم

ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا (رجسٹرڈ) کراچی

کتاب —— مقالات امام احمد رضا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار

مقالہ نگار —— پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین
پروفیسر ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم

تقدیم —— پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد

سنِ اشاعت —— ۱۹۹۱ء / ۱۴۱۲ھ

تعداد —— ایک ہزار (۱۰۰۰)

قیمت —— ۲۵ روپے۔

ناشر —— ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا

ملنے کا پتہ

ادارہ تحقیقات امام احمد رضا (رجسٹرڈ) کراچی
۲۳۴/۷ نشیمن بلڈنگ اسٹریچن روڈ ، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حرفِ آغاز

ہماری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ امام احمد رضا خان محدث بریلوی قدس سرہٗ پر تحقیق کے نئے نئے زاویے قارئین کے سامنے پیش کریں اس سلسلے میں ہم نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونی ممالک کے اسکالروں سے بھی رابطہ قائم رکھتے ہیں اور ان کو اعلیٰ حضرت کی علمی کاوشوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

الحمدللہ ہماری خوب سے خوب تر سعی و کوشش کو اہلِ قلم و معاونین کی طرف سے برابر پذیرائی نصیب ہو رہی ہے، اسی سلسلے میں امام احمد رضا انٹرنیشنل کانفرنس ۱۹۹۱ء کے لیے ہمارے دو نہایت محترم محقق اور طرز نگار شخصیات جناب پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین صاحب اور جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم صاحب نے امام احمد رضا اور ان کے معاصرین کے حوالے سے امام احمد رضا اور ابو الکلام آزاد کے افکار کے عنوان پر دو بہت ہی پُر مغز مقالات تحریر فرمائے ہیں اور چونکہ دونوں ایک ہی موضوع پر ہیں اس لیے ہم ان دونوں مقالات کو ایک ساتھ کتابی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔

اس پر پاکستان کے ممتاز ماہر تعلیم اور جامعہ کراچی کے سابق شیخ الجامعہ محترم المقام پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد صاحب نے تقدیم بھی تحریر فرمائی ہے جس میں آپ نے دونوں مقالہ نگار حضرات کی تحقیقی کاوشوں کو سراہا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین، ڈائریکٹر ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ دہلی اور پروفیسر ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم، شعبہ تقابل ادیان (اسلامک اسٹڈیز) ہمدرد یونیورسٹی، دہلی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس مقالے سے قبل دونوں مقالہ نگار حضرات سالنامہ "معارف رضا" کے لیے مقالات تحریر فرماتے رہے ہیں۔

ہم ان دونوں فاضل مقالہ نگار حضرات کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر بسیط تحقیقی مقالے تحریر کرکے اپنی علم دوستی اور اسلاف نوازی کا ثبوت دیا۔ ہم پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد صاحب کے بھی بہت شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب پر تقدیم تحریر کرکے عنوانِ کتاب کی اہمیت کو مزید اجاگر کیا اور زیر نظر مقالاجات کے مرکزی نکات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔

(ادارہ)

تقدیم

برصغیر پاک و ہند کی احیاء دین کی اسلامی تحریکات اور مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کے عمومی تناظر میں سید جمال الدین کا مقالہ زیر نظر بہ عنوان " امام احمد رضا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار " کا مطالعہ بہ غور کیا اور میرے ذوق تحقیق و تجسس کے لیے مہمیز ثابت ہوا، اور موضوع کے نئے زاویے سامنے آئے جن کا مطالعہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی و دینی تاریخ کے افہام کے لیے ناگزیر ہے۔

اس مقالہ میں سید جمال الدین صاحب نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اصل مآخذ کے حوالوں سے امام احمد رضا خان فاضل بریلوی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اور ان کے خیال میں یہ دونوں شخصیات " ہندوستان کی تاریخ اسلام میں دو الگ الگ دھاروں سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

فاضل بریلوی مسلکِ اہلسنّت پر استقامت کے ساتھ قائم، حنفی مذہب کے پابند اور سلسلہ قادریہ برکاتیہ میں داخل بیعت اور اجازت و خلافت سے سرفراز تھے، مولانا آزاد قدیم مسلکِ اہلسنّت سے جو انہیں موروثی طور پر ملا تھا، منحرف، تقلید سے برگشتہ اپنے دور کے صوفیاء و مشائخ سے بیزار تھے، وحدت دین مولانا آزاد کا پیغام تھا۔

اس مقالہ میں سید جمال الدین صاحب نے احمد رضا خان اور آزاد

کا تقابل دو اہم زاویوں سے کیا ہے۔ اوّل دونوں کے اختلافِ عقائد و مسالک پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرے، دونوں کے سیاسی نظریات و رجحانات کے تضادات کو واضح کیا ہے۔ بالعموم علماء اہلِ سنّت عقائد و فکر کے اعتبار سے "تحفۂ اثناء عشری" کے معروف مصنف شاہ عبدالعزیز دہلوی کی روایت سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ کتاب "ردِّ شیعیت" پر بڑی مستند مانی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امت اسلامیہ دو فرقوں یعنی شیعہ، سُنّی میں تقسیم تھی اور اہل سنّت میں کوئی افتراق کی کیفیت نہیں پائی جاتی تھی لیکن شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل نے جب محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کتاب "التوحید" کا اُردو ترجمہ بہ عنوان "تقویتہ الایمان" شائع کیا۔ تو اہلِ سنّت علماء کے مابین مسلک کے اختلافات کا آغاز ہوا اور یہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک روایت پسند اہل سنت اور دوسرے اہل حدیث، سلفی، غیر مقلد یا وہابی کہلائے، عام طور سے موخر الذکر گروہ کو اہلِ سنّت نے "وہابی" کا نام دیا اس لیے کہ وہ عبدالوہاب نجدی کے تعبیرات سے متاثر تھے یا اس کے قائل تھے اور اوّل الذکر گروہ کو طنزیہ انداز میں "بدعتی" کہا گیا کیونکہ بقول اہلِ حدیث کے انہوں نے اسلام میں بدعات کو شامل کر دیا تھا۔ اس طرح ایک دوسرے کے خلاف علماء صف آراء ہو گئے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے صادر کیے۔ فاضل بریلوی اپنے دَور کے روایت پسند اہل سنّت عقائد و افکار کے مستند داعی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اپنی تصانیف تقاریر اور شاعری کے ذریعہ انہوں نے "حنفیت" کے خلاف یلغار کی مدافعت کی۔ مولانا آزاد بنیادی اعتبار سے ثقہ اہلِ سنّت خانوادۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کا فکری ارتقاء میں ایک ایسا مقام آیا جب انہوں نے روایت پسندی کو ترک کر دیا۔ اور بقول سید جمال الدین صاحب مولانا آزاد نے "خود اپنا ایک علیحدہ راستہ" منتخب کیا وہ "معتزلہ، ابن تیمیہ، ابن خلدون، شاہ

اسماعیل دہلوی، سر سید احمد خان، علامہ شبلی نعمانی غرض ہر اُس فکر اور مفکر کی طرف میلان اور خوش عقیدگی رکھتے تھے، جنہیں بریلوی اہل سنت کے حلقے سے خارج سمجھتے تھے"۔

دونوں مکاتیب فکر کے مابین بعض امور عقائد میں بنیادی اختلاف ہے مثلاً غیر مقلد حضرات "توحید" پر اس طرح زور دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے صرف نظر کرنے میں کوئی تکلف نہیں محسوس کرتے، ان کے خیال میں اہل سنت ذاتِ رسول کی مدحت میں اس طرح غلو کرتے ہیں کہ شرک کے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ میلاد شریف، قیام، نیاز و فاتحہ، قبور کی زیارت، اولیاء اللہ کی کرامات، رفع یدین وغیرہ سے اختلاف ہے۔ اس موقع پر علوم عمرانی کے ایک ادنی طالب علم کی حیثیت سے میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر دین کسی معاشرہ کی روحانی اساس فراہم کرتا ہے تو اسی معاشرہ کی ظاہری ہیئت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ عام انسانوں کی وابستگی دین سے اس کی ظاہری علامت سے قائم رہتی ہے۔ اس لیے عوام میں رسوم و رواج جو شریعت الٰہی سے متصادم نہ ہوں اور ان کے حوالے سے انہیں روحانی سکون اور طمانیت قلب نصیب ہو تو اسے کفر یا شرک سے تعبیر نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اسی لیے میرے خیال میں ذات رسول سے عشق و وابستگی اور تصوف اور دیگر عوامی سطح پر اسلامی روایات و علامات معاشرہ میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اور ان کو مجتمع کرتے ہیں۔ جو سیاسی سطح پر تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد اور دیگر وہابی عقائد کے حامی علماء بالعموم اور جمعیت العلماء ہند جن کا تعلق دیو بند سے ہے، فقہ حنفی کی روایات سے برگشتہ ہو گئے ہیں اس طرح برصغیر میں ملت اسلامیہ

میں انتشار پیدا ہو گیا۔ مولانا آزاد نے میدانِ سیاست میں "متحدہ قومیت" کا قرآنی جواز میثاقِ مدینہ کی اصطلاح "امتِ واحدہ" سے پیش کی۔ مولانا حسین احمد نے بھی اس سلسلہ میں موشگافیاں کی تھیں۔ آزاد کے خیال میں "ہنود اور مسلمان" مل کر "امتِ واحدہ" تشکیل دیتے ہیں۔ اور اسی نکری بنیاد پر وہ آل انڈیا کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی ہند کے لیے کوشاں تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران مسلمانان ہند نے خلافت تحریک چلائی اور اس تحریک کی حمایت میں گاندھی اور کانگریس کا تعاون حاصل کیا، مسلمانوں نے دینی بنیاد پر تحریک کے لیے قربانیاں دیں، لیکن گاندھی، کانگریس اور ہندو اس تحریک میں آزادیٔ ہند کی خاطر شریک ہوئے۔ اور عوام میں آزادی کا شعور بیدار کرنے کے لیے ترکِ موالات کو اختیار کیا۔ گاندھی، کانگریس یا دوسرے ہندو زعماء کو "خلافت" سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اسی لیے یہ ہندو مسلم اتحاد مصنوعی اور عارضی تھا۔ مولانا آزاد کی سیاست اور ان کے نظریات کے برخلاف فاضل بریلوی کا نقطۂ نظر واضح طور پر وہی تھا جو علماء اہل سنّت نے اختیار کیا تھا یعنی یہ کہ "اہل سنّت وجماعت" برصغیر میں ملّتِ اسلامیہ کے جداگانہ تشخّص کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے وہ ہندو مسلم اتحاد کو ملّت اسلامیہ کے لیے خطرہ قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فاضل بریلوی کو "دو قومی نظریہ" کا داعی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس بات کی تصدیق دونوں ممالک کے سیاسی ردیوں سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ تحریک پاکستان کے ہراول دستہ میں علماء اہلسنّت کا نام سرفہرست آتا ہے۔ جمعیّت علماء ہند اور مولانا آزاد کے خلاف مسلم لیگ کی تائید میں ان علماء نے آل انڈیا سنّی کانفرنس کو ایک

دینی سیاسی تنظیم کی حیثیت سے قائم کیا۔ اور عوامی رابطہ کی مہم میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ نتیجہ کے طور پر مولانا آزاد اور دیگر دیوبندی علماء دنیز مولانا مودودی اور جماعت اسلامی میدان سیاست میں تنہا رہ گئے۔ اس طرح "متحدہ قومیت" کے شر سے مسلمانانِ برصغیر محفوظ رہے اور "دو قومی نظریہ" کی بنیاد پر برصغیر کی سیاسی تقسیم عمل میں آگئی اور "پاکستان" وجود میں آیا۔

اختصار کے ساتھ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ مقالہ نہ صرف یہ کہ دلچسپ ہے بلکہ آزاد اور فاضل بریلوی کے افکار و عقائد کا بہ نظر غائر تقابلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ معلوماتی بھی ہے اور "تحریک پاکستان" کے ایک اہم پہلو سے قاری کو روشناس کراتا ہے، اسی سلسلے کی دوسری کڑی ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم کا مقالہ بہ عنوان "امام احمد رضا اور مولانا آزاد کا نظریہ موالات" ہے، اس میں فاضل مقالہ نگار نے دونوں اکابر کی تحریروں کی روشنی میں برصغیر کی سیاست میں ان کے اختلافِ فکر کی نشاندہی کی ہے۔ بقول ڈاکٹر انجم فاضل بریلوی اور امام الہند مولانا آزاد دونوں نے "نعرہ اتحاد" بلند کیا، لیکن مولانا آزاد نے "ہندو مسلم اتحاد" کو برطانوی استعمار سے نجات کا ذریعہ قرار دیا۔ برعکس اس کے کہ فاضل بریلوی نے ہنود اور انگریزوں کے خلاف "مسلم اتحاد" کو لازمی قرار دیا۔

مولانا آزاد گاندھی کے نظریۂ "عدم تعاون" اور "عدم تشدد" سے بہت متاثر تھے اور وہ برطانوی سامراج کے خلاف ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ تحریک چلانا چاہتے تھے، تحریک خلافت کے دوران گاندھی کو مساجد میں منبر پر بٹھایا اور قرآن کریم کو مندر میں لے جایا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ

گاندھی نے اکبری دور کے "دین الٰہی" کی طرح گیتا، قرآن اور انجیل کا امتزاج کر کے ایک نیا ہیولا تیار کر لیا۔ یہ بعض مسلم زعماء کے لئے بہت پرکشش تھا۔ تحریکِ خلافت نے ایک ایسا موقع فراہم کیا کہ گاندھی جی ایک طرف تو مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہوئے برطانوی سامراج کے خلاف "احیاء خلافت" کی تائید کی اور دوسری جانب حصولِ آزادئ ہند کی خاطر "متحدہ قومیت" کے تصور کو فروغ دیا۔ آزاد کے نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے امام احمد رضا خان نے واضح طور پر کہا کہ یہ تصور اسلامی نظریہ سے متصادم ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر انجم نے امام احمد رضا کی تحریر کا اقتباس پیش کیا ہے۔

"ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے اصل مقصود غلامی ہنود سوراج کی چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کر دی ہے۔ بھاری بھرکم خلافت کا نام لو عوام بپھریں، چندہ خوب ملے اور گنگا و جمنا کی زمینیں آزاد کرانے کا کام چلے۔"

اے پس رو مشرکاں بہ زم زم نرسی
کیں رہ کہ تو می روی بہ گنگ وجمن است

انگریزی حکومت کے خلاف "ترکِ موالات" کو مولانا آزاد جزوِ ایمان قرار دیتے ہوئے اس کی فرضیت کو ارکان اسلام کی طرح نصِ قطعی سے ثابت کرتے تھے اس سلسلے میں فاضل مقالہ نگار نے لاہور کے انجمن حمایت اسلام کے سکریٹری پروفیسر حاکم علی کے اس مراسلہ کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں انہوں نے امام احمد رضا سے رجوع کیا تھا اور "ترک موالات" کی شرعی حیثیت سے متعلق استفسار کیا تھا، فاضل بریلوی نے ہندو و انگریز دونوں ہی سے موالات کو غیر شرعی قرار دیا اور اس موضوع پر ان کی گرانقدر تصنیف

"الحجۃ المؤتمنہ آیتہ الممتحنہ" بڑی وقیع ہے۔ بعد میں تلامذہ امام احمد رضا نے برابر "ترک موالات" کی شدید مخالفت کی۔ کیونکہ اس میں ہندو مسلم متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کرانا چاہتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کے ساتھ موالات ان کی نظر میں ہرگز درست نہیں تھا۔

اس طرح امام احمد رضا خان نے اپنے فتویٰ اور تصانیف کے ذریعہ "موالات کے تصوّر پر کاری ضرب لگائی اور مسلمانوں کو گاندھی اور ان کے زیر اثر مولانا آزاد اور دوسرے علماء کے دام تزویر سے محفوظ و مامون رکھا۔ اور "ملّت اسلامیہ" کی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھنا لازمی گردانا۔ اس طرح انہوں نے "دو قومی نظریہ" کی تائید کی جو بعد میں قیام پاکستان کی اساس ثابت ہوئی۔

دونوں مقالے معنوی اور نفس موضوع کے اعتبار سے مربوط ہیں اور ان دونوں کا کلیدی نکتہ یہی ہے کہ امام احمد رضا خان نے بحرانی دور میں مسلمانان ہند کی صحیح سمت میں رہنمائی فرمائی اور ان کو کانگریس سے دُور رکھا، اور اس طرح مولانا آزاد کی آواز ہند کی سیاست میں مسلمانوں کی حد تک صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی۔

پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد

ابتدائیہ

اہلسنت وجماعت جن کا عرف "بریلوی" ہے مطالعہ کے مستحق ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر سے اہلسنت وجماعت کا بریلوی مکتب فکر برصغیر کے مسلمانوں پر بہت اثر انداز رہا ہے۔ اس مکتب فکر کا صحیح تاریخی تناظر میں کوئی مبسوط مطالعہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ بریلوی علمائے اہلسنت کے افکار کا مطالعہ میری خاص دلچسپی کا موضوع ہے۔ پیش خدمت تصنیف اسی شوق اور دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ اس کا محور امام اہلسنت مجدد دین وملت مولوی احمد رضا خاں فاضل بریلوی (۱۹۲۱ء ـ ۱۸۵۶ء) اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار ہیں۔

معاصر شخصیتوں سے مختلف موضوعات پر فاضل بریلوی کی علمی معرکہ آرائیاں رہا کرتی تھیں۔ ابوالحسنات مولانا عبدالحئی فرنگی محلی، مولوی نذیر حسین دہلوی، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولوی محمد قاسم نانوتوی، مولوی رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند محمود حسن دیوبندی، مولوی خلیل احمد انبیٹھوی، مولوی انور شاہ کشمیری، امام الہند مولانا ابوالکلام وغیرہم کی بعض عبارتوں یا ان کے بیانات کے سلسلے میں فاضل بریلوی کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ان سے انتشار پیدا ہوگا لہٰذا یہ حضرات ان سے علانیہ توبہ ورجوع کریں۔ اس مطالبے کے نتیجے میں زبردست مناظرانہ ادب پیدا ہوا اور ایسی گرہیں پڑیں کہ اب تک کھلنے میں نہیں آتی ہیں۔ تقویۃ الایمان کی اشاعت سے پہلے ہندوستانی مسلمان صرف دو گروہوں میں منقسم تھے: اہل سنت اور اہل تشیع۔ ان میں اول الذکر کی آبادی کثیر تھی، لیکن تقویۃ الایمان کے بعد اختلافات کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ سوادِ اعظم اہل سنت سے نکل نکل کر

لوگ مختلف خیموں میں داخل ہونے لگے اور اس طرح صدیوں سے ہندوستان میں اقبال مند سوادِ اعظم اہل سنت کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ سوادِ اعظم اہل سنت کے اتحاد سے انتشار کے سفر کو تاج العلماء، مرشدی حضرت سید شاہ اولادِ رسول محمد میاں قدس سرہٗ نے مسدس شوکت اسلام (شاہی پریس امین آباد، لکھنؤ) میں اس طرح بیان کیا:

رسولِ خدا کا تھا یہ صاف فرمان ۔۔۔ مری آل واصحاب اور پاک قرآن

تمھاری ہدایت کے ہیں سب یہ سامان ۔۔۔ نہ چھوڑو کبھی ان کا بھولے سے دامان

کرو پیروی ان کے احکام کی تم ۔۔۔ سند لو انھیں سے ہر اک کام کی تم

یہ فرمان جب تک کہ پیشِ نظر تھا ۔۔۔ تو بس اپنا راہِ ہدیٰ پر گذر تھا

کسی سے نہ کچھ ہم کو خوف و خطر تھا ۔۔۔ نہ شیطان ملعون کا ہم کو ڈر تھا

نکوئی تھی دارین کی ہم کو حاصل ۔۔۔ ہمارا ہر اک شخص تھا فرد کامل

کوئی امر مشکل جو پیش ہم کو آتا ۔۔۔ حدیث اور قرآن ہمیں تھا بتاتا

صحابہ کا فرمان پتہ تھا بتلاتا ۔۔۔ ہدایت کا رستہ ہمیں تھا دکھاتا

نہ خود رائی کو کچھ بھی ہم دخل دیتے ۔۔۔ بتاتے جو وہ اس کو ہم مان لیتے

قواعد شریعت کے ہم کو بتاتے ۔۔۔ رموز طریقت تھے ہم کو سکھاتے

حقیقت کے جلوے ہمیں تھے دکھاتے ۔۔۔ وہ تھے ہم کو اللہ والا بناتے

مدارس مساجد میں وہ درس دیتے ۔۔۔ جو کچھ پوچھنا ہوتا ہم پوچھ لیتے

وہ قرآن کی تجوید ہم کو سکھاتے ۔۔۔ وہ منسوخ ناسخ ہمیں تھے بتاتے

مطالب معانی ہمیں تھے گناتے ۔۔۔ غرض وہ مفسر ہمیں تھے بناتے

جو قرآن کے معنی نبی نے سکھائے   وہی بے کم وکاست ہم کو بتاتے

سنا جو نبی سے سُنایا وہ ہم کو   حدیثوں کا حافظ بنایا وہ ہم کو
سلوک اور تصوف سکھایا وہ ہم کو   جو سیدھا تھا رستہ بتایا وہ ہم کو
بلندی پہ پہنچا ترقی کا پایا   جسے دیکھ کر چرخ نے رشک کھایا
جہاں میں ہمارا نہ تھا کوئی ہمسر   کسی کے طریقے نہ تھے ہم سے بہتر
رہا فضل خالق کا جب تک کہ ہم پر   مبارک یہ قول اُن کا تھا ہم کو ازبر
ہماری کبھی راہ مت چھوڑنا تم   نہ اس رستہ سے منھ کبھی موڑنا تم
ہم اپنے طریقے پہ ثابت قدم تھے   بزرگوں کے اپنے قدم پر قدم تھے
کسی طرح سے ہم کسی سے نہ کم تھے   سب اقوام میں سربرآوردہ ہم تھے
نہ جب تک طریقہ بزرگوں کا چھوڑا   نہ اقبال و دولت نے منھ ہم سے موڑا

. . . .

یکایک زمانہ نے گردش جو کھائی   اور ادبار و ذلت کی ساعت جو آئی
تو آکر خودی دل میں ایسی سمائی   کہ ہاتھوں سے کھو بیٹھے اپنی کمائی
وہ دولت جو صدہا برس سے تھی ہم میں   گنوائی خودی نے وہ اک دم کی دم میں
خودی نے یہ کانوں میں آکر پکارا   کہ ہے تجربہ تم کو کافی تمھارا
سلف کا یہ کرتے ہو تم کیوں سہارا   یہ تکلیف کرتے ہو تم کیوں گوارا
تمھاری سی تحقیق اُن میں کہاں تھی   یہ تدقیق اُن کی نظر سے نہاں تھی

خودی نے سبق آ کے جب یہ پڑھایا — تو شیطان کے ہاتھ بھی وقت آیا
وہ دے دھوکہ اس راہ پر اُن کو لایا — کہ رستہ بزرگوں کا ان سے چھڑایا
حدیثوں میں دینے لگے دخل اپنا — لگے کرنے قرآن میں تاویل بیجا
غرض راہ پر اپنی شیطان لایا — خودی نے بھی رنگ اپنا جو کھا جمایا
نہ سوجھا انھیں پھر تو اپنا پرایا — پُرانا وہی راگ شیطاں کا گایا
کہ ہم ہیں سلف سے بہر حال بہتر — کسی امر میں ہم نہیں اُن سے کمتر
بنے مجتہد اور مجدد یہ جاہل — سمجھنے لگے آپ کو سب سے عاقل
مقلّد کو کہتے ہیں یہ لوگ غافل — ہے تقلید آرام میں ان کے حائل
غرض باقی پیرو ہیں جو مصطفیٰ کے — شب و روز ہوتے ہیں ان پر تبرے

امام احمد رضا فاضل بریلوی کے افکار، اُن کی تحریک کو سمجھنے میں مندرجہ بالا مسدس کے اشعار سے بہت مدد ملتی ہے۔ فاضل بریلوی کو اپنے دینی اور تہذیبی ورثے میں "سواد اعظم" ملا۔ انھوں نے اس سواد اعظم کو قلب سے لگایا' اپنے ذہن کو اس سے ہم آہنگ کیا اور اس کی خدمت کے لیے اپنے قلم کو رواں کر دیا۔ ان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ دین مبین اور سواد اعظم، جس پر نسل بعد نسل مسلمانانِ عالم بالعموم اور مسلمانانِ ہند بالخصوص قائم تھے۔ اس پر جارحانہ حملہ کرنے والوں کے خلاف قلمی اور علمی جہاد فرمایا۔ اس میں منفی طرز نہیں تھا۔ وہ دلائل اور معقولات کے ذریعے اپنی بات رکھتے تھے، کوئی پھر بھی ہٹ دھرمی کرے تب اُن کا قلم شمشیر بن جاتا۔ اُن کے معترضین نے اُن کی شمشیر زیادہ دیکھی اور اس کی چمک سے آنکھیں اس قدر خیرہ ہوگئیں کہ ان کے علم' ان کے فاضلانہ مقالات ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ حق اور انصاف کا یہ تقاضا تھا کہ ان کی شمشیر دیکھنے سے پہلے ان کی علمی تحریروں کا جائزہ لے لیا ہوتا۔

یہاں امام اہلسنت اور امام الہند کے درمیان علمی معرکہ آرائی کو تاریخی سیاق میں سمجھنے اور پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ تمام بحث تحریک خلافت اور عدم تعاون کے اردگرد گھومتی ہے۔ یہ سیاسی تحریکیں تھیں اور ہماری قومی تحریک کا حصہ بھی۔ قومی سیاست اور ملّی مسائل اس بات کے متقاضی تھے کہ علماء اجتہاد کریں۔ مسئلہ یہ تھا کہ اجتہاد تقلید کے دائرے میں رہ کر کیا جائے یا تقلید سے آزاد ہو کر۔ امام اہلسنت نے تقلید کا راستہ اختیار کیا اور امام الہند نے تقلید سے ہٹ کر راہ اختیار کی۔ یہی سبب تھا کہ دونوں میں علمی معرکہ آرائی رہی جسے پیش خدمت کتاب میں صحیح تاریخی تناظر میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس طرح معترضین آزاد میں سے ایک اہم گروہ کا نقطۂ نظر محققین کے سامنے مزید تحقیق و جستجو کے لیے پیش کر دیا گیا ہے۔

سید جمال الدین

مقالۂ اوّل

پروفیسر ڈاکٹر سید جمال الدین

اے پسرِ مشرکان بزمزم نرسی
کین رہ کہ تو میروی بہ گنگ و جمن است[1]

یہ ہے وہ طنز اور استہزاء جس کا رُخ بریلوی مکتب فکر کے بانی امام احمد رضا خاں نے مولانا ابو الکلام آزاد کی طرف کیا ہے۔ پیش نظر مطالعہ میں اِسی طنز اور استہزار کو تاریخی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

'مجدّد مائتہ حاضرہ' امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی اور امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد ہندوستان کی تاریخ اسلام میں دو الگ الگ دھاروں سے جُڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فاضل بریلوی مسلکِ اہلسنّت پر استقامت کے ساتھ قائم، حنفی مذہب کے پابند اور سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں داخل بیعت اور اجازت و خلافت سے سرفراز تھے۔ مولانا آزاد قدیم مسلکِ اہلسنّت سے، جو اُنھیں موروثی طور پر ملا تھا، منحرف، تقلید سے برگشتہ، اپنے دور کے صوفیاء و مشائخ سے بیزار تھے۔ وحدتِ دین مولانا آزاد کا پیغام تھا اور استقامت فی الدین فاضل بریلوی کا۔ دونوں کی کامیابی کا معیار اگر ان کے پیرؤں کے اعداد و شمار پر کیا جائے تو فاضل بریلوی کامیاب قرار دیے جائیں گے۔ مولانا آزاد تاریخ کا حصّہ تو ضرور ہیں۔ اُن کی دینیات، اُن کی سیاست، اُن کی قومی تحریک کی رہنمائی علمی بحث کا

موضوع رہتے ہیں جہاں ان سے اتفاق اور اختلاف کی گنجائشیں بھی ہیں۔ اُن کے عقیدتمند بھی ہیں، اُن کی یاد تازہ رکھی گئی ہے لیکن اُنھیں پیرو نہیں ملے جو ان کے فلسفہ کی تبلیغ، اُن کے وحدتِ دین کے درس کی اشاعت کرتے۔ اس کے برعکس فاضل بریلوی ایک مکتبِ فکر میں تبدیل ہو کر بقائے دوام پا گئے ہیں۔ بلاشبہ اُن کی شخصیت تنازعوں اور مناقشوں سے گھری ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے مخالفین پر بڑھ بڑھ کر وار کیے اور ان کے قلم کی زد پر جو بھی آیا بُری طرح گھائل ہوا:

وہ رضا کے نیزہ کی مار ہے کہ عدو کے سینے میں غار ہے
کسے چارہ جوئی کا وار ہے کہ وار وار سے پار ہے

برصغیر میں نیشنلسٹ آزاد کو تغافل اور اہلسنت کے علمبردار احمد رضا کو بقائے دوام نصیب ہوا۔ اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں، بڑی صداقت ہے۔ ہندوپاک میں متعدد مدرسے اور جامعات کی فکری اساس بریلوی افکار پر ہے۔ خانقاہیں مرکزِ اہلسنت بریلی سے اپنی وابستگی پر فخر کرتی ہیں، قادریہ برکاتیہ سلسلہ کی شاخ بن کر سلسلۂ رضویہ برصغیر کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے، بہت سی مذہبی تنظیمیں، ادارے، مکتبے، مدارس و جامعات اور مساجد فاضل بریلوی کے نام سے موسوم ہیں، میلاد کی محفلوں میں اُن کا نعتیہ کلام پڑھا جاتا ہے۔ اُن کا مشہور سلام ؎ مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام کی صدا شہر شہر، قریہ قریہ بلند کی جاتی ہے۔ اُن کے طرزِ فکر پر چلنے والے ائمہ اور خطیب اور مدرس مسجدوں اور جامعات میں اپنے فرائضِ منصبی انجام دے رہے ہیں۔ ان کے اُردو ترجمۂ قرآن کنز الایمان کے متعدد ایڈیشن مختلف سائزوں پر اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کے فتاویٰ (موسوم بہ فتاویٰ رضویہ) حنفی فقہ کے

بہترین ترجمان تسلیم کیے گئے ہیں حتٰی کہ اُن کے مخالفین بھی ان کے فتاویٰ سے استفادہ کرتے ہیں۔ ۱۹۸۹ء کے اواخر میں ہم نے عام انتخابات کے موقع پر دیکھا کہ سیاسی جماعتیں بریلوی مراکز سے اپنے اپنے حق میں فتاویٰ اور مکتوبات حاصل کررہی تھیں۔ ہاں، مولانا آزاد کے نام پر بھی اکیڈیمیاں، کتب خانے، تعلیمی اور ثقافتی ادارے قائم ہوئے۔ لیکن کیا یہ ادارے اُس طرز فکر کی حمایت یا تبلیغ و اشاعت کی طرف بھی مائل ہیں جو مولانا آزاد کا طرۂ امتیاز تھا؟ غالباً جواب نفی ہی میں ملے گا. امام الہند کا احترام کیا جاتا ہے، اُن کی پیروی یا تقلید نہیں کی جاتی.

یہاں یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ امام اہلسنت مولانا احمد رضا خاں کو زندگی میں بھی اور بعد وفات بھی لاکھوں کی تعداد میں پیرو ملے لیکن امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کیوں تنہا رہ گئے۔ میری سمجھ میں جواب بہت مختصر ہے کہ فاضل بریلوی امام اہلسنت بن کر مخصوص ہو گئے، انھوں نے تقلید کے اصول پر سختی سے عمل کر کے مقلد بنا دیے. مولانا آزاد امام الہند بن کر برصغیر کی وسعتوں میں گم ہو گئے، تقلید سے انحراف کر کے انھوں نے اپنے نظریات کی تقلید کی بھی، نفی کا راستہ دکھایا اور نتیجہ یہ کہ وہ مقلد نہیں بنا سکے۔ لیکن یہ نکتہ کسی قدر مفصل بیان ہو جائے تو اُس طنز اور استہزار کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی جس کا ذکر اس مقالے کی ابتدا میں کیا گیا۔

امام الہند اور امام اہلسنت دونوں کی جڑیں شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے مکتب فکر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ امام الہند کے والد مولانا خیرالدین کی تعلیم و تربیت ان کے نانا مولانا منورالدین کے سایۂ شفقت میں ہوئی تھی[۲۲] خود مولانا منورالدین، شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ درس میں شامل رہے تھے[۲۳] امام اہلسنت کے پیر و مرشد سید شاہ آل رسول بھی شاہ عبدالعزیز کے تلمیذ تھے[۲۴]

لیکن آگے چل کر ایسا ہوتا ہے کہ مولانا آزاد اپنے بزرگوں کے توسط سے چلی آرہی شاہ عبدالعزیز دہلوی کی روایت سے ہٹ گئے تھے. مولانا آزاد کی رائے تھی کہ شاہ عبدالعزیز ہی بعض معاملات اور طریقوں میں اپنے والد شاہ ولی اللہ کے طریقے پر نہیں تھے. عشرے کی شب اُن کے والد جو ذکر شہادت کی مجلس منعقد کرتے تھے اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں :

.... علی الخصوص عشرے کی شب کو ذکرِ شہادت پر جو بیان ہوتا تھا، وہ نہایت عجیب ہوتا تھا۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ اُن کے سادہ بیان میں جس قدر گریہ وبکا ہوتی تھی، اُتنی لکھنؤ کی بڑی بڑی مجالسِ عزا کو بھی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

علماء کو اِن طریقوں سے اتفاق نہ تھا، وہ مثلِ دیگر مجلسی تعینات کے اس اختصاص کو بھی بدعت قرار دیتے تھے اور اس طرح کے غلو کو ایک طرح مخفی تشیُّع سے تعبیر کرتے تھے، جو علمائے اہلسنت میں بھی غیر محسوس طور پر پھیل گیا ہے مگر والد مرحوم اپنے طریقے پر بہت مصر تھے. اُن ہی کے بیان سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ اہلسنت میں اس طرح سے ذکرِ شہادت کا بیان کرنا، شاہ عبدالعزیز نے شروع کیا تھا، اور یہ بھی منجملہ اُن رسمی معاملات کے ہے، جن کو وقت وعصر سے متاثر ہوکر شاہ صاحب نے اختیار کرلیا تھا، حالانکہ اُن کے والد بزرگوار کا مسلک ان چیزوں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ [۵۵]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا آزاد شاہ ولی اللہ کے مسلک اور شاہ عبدالعزیز کے طریقوں میں فرق پاتے تھے اور مؤخر الذکر کے طریقوں کی طرف

خود بھی مائل نہ تھے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ولی اللٰہی مکتب فکر سے کئی ایسے سلسلے چلے جو ایک دوسرے کی ضد تھے اور جن کے درمیان مباحث اور مناقشات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ایسے تین سلسلوں کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں کیا ہے، اُن میں سے ایک سلسلہ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں رد بدعت اور توحید خالص کے جذبہ کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ نمایاں رہا۔ ایک اور سلسلہ مولانا سید نذیر حسین دہلوی سے چلا۔ اس سلسلہ میں توحید خالص اور رد بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں رہا اور یہ سلسلہ 'اہل حدیث' کے نام سے مشہور ہوا۔ تیسرے سلسلہ کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "یہ وہ تھا، جو شدت کے ساتھ اپنی پرانی روش پر قائم رہا اور اپنے کو اہل السنۃ کہتا رہا۔ اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علمار تھے۔"[۱۶] اس تیسرے سلسلہ کے علمار نے شاہ عبد العزیز سے اپنی وابستگی کو برقرار رکھا کیوں کہ علمائے بریلی اور علمائے بدایوں کو یہ تعلق اور نسبت اپنے مشائخ مارہرہ سے ملی تھی۔

شاہ ولی اللٰہی مکتب فکر میں سب سے پہلا نفاق یا رخنہ اُس وقت پیش آیا جب شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبد العزیز کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل دہلوی نے محمد بن عبد الوہاب نجدی کی کتاب 'التوحید' کو اردو زبان میں تقویۃ الایمان کے نام سے ۱۲۴۰ھ میں شائع کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کے دو ہی اہم طبقے تھے اہلسنت وجماعت اور شیعہ۔ تقویۃ الایمان کی اشاعت سے علمائے اہلسنت کے حلقوں میں ہلچل پڑ گئی۔ ایک بریلوی عالم اس کتاب کے ظہور سے پیدا ہونے والے حالات پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: "اس کتاب سے مذہبی آزادی

کا دور شروع ہوا۔ کوئی غیر مقلد ہوا، کوئی وہابی بنا، کوئی اہل حدیث کہلایا۔ کسی نے اپنے کو سلفی کہا۔ ائمہ مجتہدین کی جو منزلت اور احترام دل میں تھا وہ ختم ہوا۔ معمولی نوشت وخواند کے افراد امام بننے لگے اور افسوس اس بات کا ہے کہ توحید کی حفاظت کے نام پر بارگاہِ نبوت کی تعظیم واحترام میں تقصیرات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا"۔[۴۵]

مولانا آزاد نے بھی اُن مسائل کا ذکر کیا ہے جو تقویۃ الایمان کی اشاعت کے بعد علمائے مخالفین کے درمیان زیر بحث رہے۔ جیسے "امتناعِ نظیر خاتم النبیین، حقیقتِ بدعت، شہداء وقبور واموات سے استغاثہ واستمداد، رفع الیدین، حقیقت شرک، توصل الیٰ غیر اللہ، ما اہل بغیر اللہ میں تسمیہ کا اعتبار عند الذبح یا اہلال؟"[۴۶] مولانا آزاد کے والد کے نانا مولانا منورالدین نے ان بحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں شاہ اسمٰعیل کے رد میں "سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منورالدین نے دکھائی"۔[۴۷] نہ صرف یہ کہ انھوں نے رد میں متعدد کتابیں لکھیں بلکہ ۱۲۴۸ھ میں مشہور مباحثۂ جامع مسجد بھی منعقد کیا۔ تمام علمائے ہند سے فتویٰ مرتب کروایا اور حرمین سے بھی فتویٰ منگوایا۔[۴۸] اس مسئلے میں علامہ فضل حق خیرآبادی، شاہ فضلِ رسول بدایونی اور مولانا خیرالدین بھی پیش پیش تھے اور اُن کا بھی وہی موقف تھا جو مولانا منورالدین کا تھا۔ تقویۃ الایمان کے بطن سے جو مسائل پیدا ہوئے اُن میں اہم ترین مسئلہ امکان کذب باری تعالیٰ ومسئلہ امکان نظیر خاتم النبیین تھے۔ لیکن ان مسائل کی وجہ سے مباحثوں اور مناقشوں کا جو سلسلہ چلا وہ تیرہویں صدی ہجری کے اواخر تک علماء ہی تک محدود رہا۔[۴۹] (مولانا احمد حسن کانپوری (متوفی ۱۳۲۲ھ)، مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی نے شاہ اسمٰعیل دہلوی کے رد میں رسالے لکھے۔ فاضل بریلوی نے بھی رد میں رسالہ لکھا جس کا عنوان تھا سُبحن السبوح عن عیب کذب مقبوح)۔

چودہویں صدی ہجری میں بھی اِن مسائل کو لے کر جو شاہ اسمٰعیل دہلوی نے

چھیڑ دیے تھے مباحث جاری رہے۔ علماء دیوبند نے شاہ اسمٰعیل کے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی تحریروں میں بعض ایسی عبارتیں شامل کردیں جو عقائد اہلسنت کے خلاف تھیں۔ حالانکہ دارالعلوم دیوبند کی اساس میں حنفی مذہب کے ساتھ شعار وفاداری کی روایت شامل تھی [۲۵] لیکن بالخصوص تصور رسالت کو لے کر فاضل بریلوی نے دیوبند کے ان علماء کا تعاقب کیا جن پر اُن کا الزام تھا کہ وہ اہانت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مرتکب ہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ علمائے دیوبند توبہ اور رجوع کریں۔ جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے اُن کی تکفیر کی۔ دیوبندی علماء امت رسول اللہ سے خارج قرار دیے گئے اور وہ اور اُن کے پیرو نجدی یا وہابی کہلائے جانے لگے کیونکہ اُن کے عقائد و افکار کا ماخذ شاہ اسمٰعیل دہلوی کے توسط سے دراصل محمد بن عبدالوہاب نجدی تھے۔ نجدیوں وہابیوں کو جہنم کا مستحق قرار دیا گیا۔ فاضل بریلوی نے اپنے نعتیہ کلام میں بھی ایسے ہی شدید جذبات کا اظہار کیا:

ذکر روکے فضل کاٹے نقص کا جویاں رہے

پھر کہے مردک کہ ہوں اُمت رسول اللہ کی

تجھ سے اور جنت سے کیا مطلب وہابی دور ہو

ہم رسول اللہ کے جنت رسول اللہ کی

شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب

اُس بُرے مذہب پہ لعنت کیجیے

مومن وہ ہے جو ان کی عزت پہ مرے دل سے

تعظیم بھی کرتا ہے نجدی تو مرے دل سے

فاضل بریلوی نے چونکہ اہلسنت وجماعت کے قدیم مذہب سے ذرہ

برابر بھی انحراف نہیں کیا اسی لیے اُن کا اصرار تھا کہ درحقیقت وہی سنّی ہیں۔ اس طرح سنّی اور وہابی کی اصطلاحیں عام ہوگیئں۔ بریلی کی نسبت سے مخالفین نے سنیّوں کو بریلوی کہنا شروع کردیا۔ لیکن بریلیوں نے اپنے کو ناجی قرار دیا۔

وہ فرقہ ہے ناجی یہ اہلِ جماعت   کہ جن کا ہے مسلک کتاب اور سنّت
محمد کی جن پر ہے بے حد عنایت   بڑی جن کی دربارِ حق میں ہے عزّت
ہمیشہ یہ دیں پر ہی قائم رہیں گے   کسی کے نہ بہکانے سے یہ ڈگیں گے

فاضل بریلوی متمول زمیندار خاندان کے فرد تھے۔ اسی لیے خود اپنے خاص صرفے سے انھوں نے بریلی کو اہلسنت کے مرکز میں تبدیل کر دیا۔ ایک دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔ دارالافتاء قائم کیا۔ علمائے دیوبند اور دوسرے مخالف علمار نے جس طرح خانقاہی نظام پر حملے کیے اُس سے خانقاہوں کو بہت دھکّا پہنچا تھا شاید اسی لیے مختلف خانقاہوں کے صاحبزادگان اور پیرزادگان امام اہلسنت کے حلقہ بگوش ہورہے تھے۔ خانقاہی نظام کو جو قوت اور توانائی امام اہلسنت سے حاصل ہوئی اُس کا اعتراف ایک صوفی خانوادہ کے شیخ طریقت خواجہ حسن نظامی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> اُن کے مخالف اعتراض کرتے ہیں کہ مولانا (احمد رضا خاں) کی تحریروں میں سختی بہت ہے اور بہت جلدی دوسروں پر کفر کا فتویٰ لگادیتے ہیں۔ مگر شاید اُن لوگوں نے اسمٰعیل شہید اور ان کے حواریوں کی دل آزار کتابیں نہیں پڑھیں جن کو سالہا سال صوفیائے کرام برداشت کرتے رہے۔ ان کتابوں میں جیسی سخت کلامی برتی گئی ہے اُس کے مقابلے میں جہاں تک میرا خیال ہے مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اب تک بہت کم

لکھا ہے۔ جماعت صوفیہ علمی حیثیت سے موصوف کو اپنا بہادر،
صف شکن سیف اللہ سمجھتی ہے اور انصاف یہ ہے کہ بالکل
جائز سمجھتی ہے۔[۱۳]

اہل سنت وجماعت کے قدیم مذہب کی پیروی اور خانقاہی نظام سے
وابستگی کے باعث امام اہلسنت کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہوگیا تھا۔

فاضل بریلوی کی طرح مولانا آزاد بھی سنّی حنفی خانوادہ سے وابستہ تھے۔ اوپر
ذکر کیا جاچکا ہے کہ اُن کے والد کے نانا مولانا منورالدین نے شاہ اسماعیل دہلوی کے
عقائد کے رد میں نمایاں رول انجام دیا۔ مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین بھی وہابیوں کے
شدید مخالف تھے۔ اس کی تفصیل مولانا آزاد ہی کے الفاظ میں نقل کرنا مناسب ہوگا:

> ابتداہی سے اُن کی (مولانا آزاد کے والد کی) طبیعت
> میں وہابیوں کے متعلق سخت تعصب قائم ہوگیا تھا اور یہ آخر
> تک بڑھتا ہی گیا۔ اس بارے میں اُن کی طبیعت کا کچھ عجیب
> حال تھا۔ ہر طرح کی رسوم، ہر طرح کی بدعات، جو سخت سے سخت
> آخری درجے کی کہی جاسکتی ہیں، ان سب کی وہ توجیہیں کرتے
> تھے اور کسی کو بھی قابلِ رد اور قابلِ اعتراض نہ قرار دیتے تھے
> اور اگر کوئی ذرا سا بھی اُن پر اعتراض کرے تو اس کو وہابیوں کی
> طرف منسوب کردیتے تھے۔ بعد کو میں نے دیکھا تو اس بارے میں
> مقلدین حنفیہ کے جو مختلف حلقے نظر آتے ہیں، اُن میں سب سے
> زیادہ تنگ حلقہ ان کے مشرب کا تھا اور ہندوستان کے گذشتہ
> علماء میں صرف مولوی فضل رسول بدایونی، جنھوں نے تقویۃ الایمان
> کے رَد میں سوط الرحمٰن لکھی ہے، ٹھیک اسی رنگ پر تھے جو

اس بارے میں والد مرحوم کا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوستان کا
کوئی سخت سے سخت حنفی عالم بھی ان کے معیارِ حنفیت پر نہیں
اتر سکتا تھا۔[۱۴]

مولانا خیر الدین کی کسی کو حنفی پرکھنے کی کسوٹی بہت سخت تھی۔ مولانا آزاد
کا بیان ہے کہ مولوی احمد رضا خاں بھی اس کسوٹی پر نہیں اُترے۔ لکھتے ہیں:

غالباً ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ مولوی احمد رضا خاں
بریلوی ان سے ملنے کے لیے کلکتہ آئے، جن سے اُن کے برابر
تعلقات رہے تھے اور بارہا ہم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ شخص
بلاشبہ صحیح الاعتقاد ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے ساتھ
بعض اپنی تصانیف لائے، اور چونکہ شیخ احمد دحلان، والد کے
خاص دوست تھے اس لیے اُنھوں نے خاص طور پر اپنا ایک رسالہ
دیا جو ان کے رَد میں لکھا اور اُس میں عدمِ ایمان ابوین آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان ابوطالب پر زور دیا تھا۔ چنانچہ اس
پر کچھ دیر تک والد نے اُن کا ایسا تعاقب کیا کہ آخر وہ ہکّا بکّا
رہ گئے اور خاموش چلے گئے۔ جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اس
شخص کے عقیدے میں بھی فتور ہے۔[۱۵]

مجھے مولانا آزاد کے اس بیان کو بعینہٖ تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہے کیونکہ
انھوں نے دو ایسے علمائے بدایوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ جن سے ان کے والد کو خاص
تعلق تھا اور جنھیں وہ اپنا ہم عقیدہ تصور کرتے تھے، یعنی مولانا فضل رسول اور مولانا
عبدالقادر۔ فاضل بریلوی کی طرح یہ دونوں بدایونی علماء بھی خانقاہ برکاتیہ مارہرہ کے
متوسلین میں سے تھے۔ اور اس طرح برکاتی نسبت اُن میں قدرِ مشترک تھی۔ علاوہ ازیں

مولانا آزاد کا یہ بیان پڑھنے کے بعد کہ ان کے والد "علمائے حال میں مولانا عبد القادر بدایونی کی تعریف کرتے تھے اور ان کی حنفیت پر معترض نہ تھے"[۱۶] پچھلے بیان کو تسلیم کرنے میں پس و پیش ہوتا ہے کیونکہ انہی مولانا عبد القادر بدایونی کے صاحبزادہ مولانا عبد المقتدر بدایونی ہیں جنھوں نے ۱۹۰۰ء میں پٹنہ کے ایک عام جلسہ فاضل بریلوی کو 'مجدد مائتہ حاضرہ' کا لقب دیا تھا ظاہر ہے مولانا عبد المقتدر کو فاضل بریلوی کی حنفیت پر پورا اعتماد رہا ہوگا۔

مولانا آزاد کو اپنے خاندانی ماحول میں وہابیوں سے شدید نفرت ورثہ میں ملی تھی جسے بعد میں انھوں نے ترک کر دیا لیکن اس نفرت کی کیا نوعیت تھی اس کا نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:

> .... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں میرا خیال یہ تھا کہ وہابی کوئی خاص طرح کا ایک بڑا ہی مکروہ اور قابلِ نفرت مخلوق ہے۔[۱۷]
>
> .....
>
> .... جب ذرا اور بڑے ہوئے تو والد مرحوم کے وعظ اور گھر کی باتوں کو بھی خوب سمجھنے لگے۔ ہمیشہ وہابیوں کے عقائد کا رد رہتا تھا.... رد ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتا تھا جس کے صاف معنی اُن پر لعن اور اُن کی تکفیر کے تھے۔ ہم نے سیکڑوں مرتبہ والد مرحوم سے سُنا کہ اُن کا کفر، یہود و نصاریٰ کے کفر سے بھی اشد ہے....[۱۸]
>
> .....
>
> بہر حال بچپن میں جو تعریف وہابیت کی ہمارے دل پر نقش

ہوگئی تھی وہ یہی تھی۔ وہابیوں کا دشمن اسلام ہونا، خاصتہً آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اُن کا بغض، آنحضرت کی تحقیر، اولیاء اللہ سے دشمنی، تمام عقائدِ اسلامیہ سے انکار، اور اس طرح کی صدہا باتیں تھیں جو بطور یقینیات کے کہی جاتی تھیں۔۔۔۔ یہ بات کہ وہابی، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منکر ہیں، ایک ایسا مُسلّم واقعہ تھا، جو بلا کسی تمہید و استدلال کے ہمیشہ بولا جاتا تھا۔[۱۹]

×××

ہمیں اُس وقت یقین تھا کہ وہابی اُن لوگوں کو کہتے ہیں، جو اوّل تو نبیؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فضیلت کے قائل ہی نہیں، اگر قائل ہیں بھی، تو صرف اتنے جیسے چھوٹے بھائی کے لیے بڑا بھائی۔ معجزات کے بھی منکر ہیں۔ ختم نبوّت کے بھی قائل نہیں۔ آنحضرتؐ سے تو اُن کو ایک خاص بغض ہے۔ جہاں کوئی بات اُن کی فضیلت و منقبت کی آئی اور انھیں مرچیں لگیں۔ مجلس میلاد کے اس لیے منکر ہیں کہ اس میں آنحضرتؐ کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں۔ قیام کے لیے اس لیے منکر ہیں کہ اس میں آنحضرت کی تعلیم ہے درود پڑھنے کو بھی بُرا جانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ مت کہو، کیونکہ رسول اللہ کی یاد انھیں کیوں پسند آنے لگی! جہاں کوئی بات رسولؐ کی فضیلت، اولیاء اللہ کی منقبت، بزرگانِ دین کی کہی جائے یا کی جائے، فوراً اسے شرک و بدعت کہہ دیتے۔ اس لیے کہ انھیں ان سب سے بغض و کینہ ہے، اور ان

کی توہین و تذلیل اُن کو خوش آتی ہے! بحیثیت مجموعی وہابیوں کے
بدترین خلائق ہونے، کافر ہونے، کافروں میں بھی بدترین قسم
کے کافر ہونے میں کسی رد و کد کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔[۲۰]

مولانا آزاد نے اس طرح کے خاندانی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ یہ ماحول لازمی طور پر اُن کے والد اور والد کے نانا منورالدین کا بنایا ہوا تھا اور اِس میں فاضل بریلوی کا کوئی دخل نہیں تھا جو مولانا آزاد کے مطابق اُن کے والد کی حنفیت کی کسوٹی پر پوری طرح نہیں اُترے تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فاضل بریلوی کی نظروں میں بھی وہابیوں کی ایسی ہی تصویر تھی جیسی کہ مولانا آزاد کو اُن کے خاندان میں دکھائی جاتی تھی۔ حدائق بخشش میں ایسے متعدد اشعار ملیں گے جنھیں یکجا کر دیا جائے تو اُن سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہابیوں پر کیسی کیسی چوٹیں کی جاتی تھیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

آج لے ان کی پناہ آج مدد مانگ اُن سے
پھر نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا
اُف رے منکر یہ بڑھا جوشِ تعصب آخر
بھیڑ میں ہاتھ سے کم بخت کے ایمان گیا

وہ جہنم میں گیا جو اُن سے مستغنی ہوا
ہے خلیل اللہ کو حاجت رسول اللہ کی
سورج اُلٹے پاؤں پلٹے چاند اشارے سے ہو چاک
اندھے نجدی دیکھ لے قدرت رسول اللہ کی

نجدی اس نے تجھ کو مہلت دی کہ اس عالم میں ہے
کافر و مرتد پہ بھی رحمت رسول اللہ کی

تر اکھائیں تیرے غلاموں سے اُلجھیں
ہیں منکر عجب کھانے غرّانے والے
رہے گا یوں ہی اُن کا چرچا رہے گا
پڑے خاک ہو جائیں جل جانے والے
تو زندہ ہے واللہ تو زندہ ہے واللہ
مرے چشمِ عالم سے چھپ جانے والے

مثلِ فارس زلزلے ہوں نجد میں
ذکر آیاتِ ولادت کیجئے
غیظ میں جل جائیں بیدینوں کے دل
یا رسول اللہ کی کثرت کیجئے
شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب
اُس بُرے مذہب پہ لعنت کیجئے
ظالمو، محبوب کا حق تھا یہی
عشق کے بدلے عداوت کیجئے
بیٹھتے اٹھتے حضور پاک سے
التجا و استعانت کیجئے
یا رسول اللہ دہائی آپ کی
گوشمالِ اہلِ بدعت کیجئے

بیٹھتے اُٹھتے مدد کے واسطے
یارسول اللہ کہا پھر تجھ کو کیا
نجدی مرتا ہے کہ کیوں تعظیم کی
یہ ہمارا دین تھا پھر تجھ کو کیا

مگر خدا پہ جو دھبہ دروغ کا تھوپا
یہ کس لعیں کی غلامی کا داغ لے کے چلے
وقوع کذب کے معنی درست اور قدوس
ہیئے کی پھوٹے عجب سبز باغ لے کے چلے
جہاں میں کوئی بھی کافر سا کافر ایسا ہے
کہ اپنے رب پہ سفاہت کا داغ لے کے چلے

اہلسنت وجماعت سے منحرف وہابیوں کی طرف سے مولانا آزاد کے دل میں تو ہمدردی پیدا ہوگئی اور بچپن میں جو ان کے ذہن پر نقش بنا تھا وہ دُھل گیا۔ لیکن فاضل بریلوی کی تمام زندگی کا مشن ہی یہ بن گیا تھا کہ وہ وہابیوں کا رد کریں انھیں عقائد اہلسنت کا دفاع کرنا تھا اور اہلسنت وجماعت کو ایک مرکز پر رکھنا تھا۔ مولانا آزاد اپنے آبائی مذہب سے جو تقلید کے اصول پر مبنی تھا ہٹ چکے تھے۔ بریلوی، مولانا آزاد کو اہلسنت وجماعت یا علمائے اہلسنت میں کیسے شمار کرسکتے تھے جب کہ خود مولانا اپنا ایک علیٰحدہ راستہ منتخب کرچکے تھے وہ معتزلہ، ابن تیمیہ، ابن خلدون شاہ اسماعیل دہلوی، سرسید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی غرض ہر اُس فکر اور مفکر کی طرف میلان اور خوش عقیدگی رکھتے تھے جنھیں بریلوی اہلسنت کے حلقے سے خارج سمجھتے تھے۔ یہی وجوہات رہی ہوں گی کہ علمائے اہلسنت یا بریلوی علمار نے

انھیں مسٹر آزاد کا لقب دیا۔ جسے امام الہند ہونے کا دعویٰ ہو وہ اس لقب میں پوشیدہ طنز واستہزار کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

بریلیوں نے دیکھا کہ مسٹر آزاد سیاست میں بھی عمل دخل رکھتے ہیں اور حالانکہ ملکی سیاست فاضل بریلوی کے دائرۂ عمل میں شامل نہیں تھی لیکن وہ اس صورت میں خاموش نہیں رہ سکتے تھے جب سیاست کو مذہب سے جوڑا اور اس مقصد سے مذہب کی توضیح وتشریح کے لیے غیر رسمی طریقہ اختیار کیا جارہا ہو۔ جنگِ آزادی کی تاریخ کے دو مرحلے ایسے ہیں جب بریلیوں نے بھی ملکی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ایک تو خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے موقع پر اور دوسرے قیام پاکستان کے مطالبہ کو لے کر دونوں ہی بار سیاست اور مذہب ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تھے۔ دس سال قبل میں نے جامعہ ہی میں ایک سیمینار میں مقالہ پیش کیا تھا جس کا عنوان تھا: 'دی بریلویز اینڈ دی خلافت موومنٹ' جو بعد ازاں

مشیر الحسن کی مرتب کی ہوئی کتاب کمیونل اینڈ پین اسلامک ٹرینڈس ان کالونیل انڈیا (مطبوعہ دہلی، ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا۔ اس موضوع پر دس سال کے وقفہ کے بعد بھی میں کچھ اضافہ نہیں کرسکتا البتہ خلافت تحریک کے تعلق سے فاضل بریلوی اور مولانا آزاد کے درمیان جو صف آرائی ہوئی اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرسکتا ہوں۔ اس طرح اس موضوع پر ایک مرتبہ پھر اس بریلوی لٹریچر کو پیش کرسکوں گا جو شائع شدہ ہونے کے باوجود ہمارے مورخین کی نگاہ میں نہیں آیا ہے۔

خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں سے متعلق بریلوی لٹریچر کے سلسلے میں اس طرف خاص توجہ دلانا چاہوں گا کہ 'نظریۂ پاکستان' کی اشاعت میں اس لٹریچر سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس مقالے کی تیاری کے سلسلے میں جو پاکستان میں شائع لٹریچر میرے پیش نظر رہا اور جو ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے وہ حسب ذیل ہے:

۱۔ دوامُ العیش فی الائمۃ من قریش، مکتبہ رضویہ، لاہور، ۱۹۸۰ء

۲۔ فاضل بریلوی اور ترک موالات، پروفیسر محمد مسعود احمد، رضا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۱ء

۳۔ اکرامِ امام احمد رضا، تصنیف مفتی برہان الحق جبلپوری، ترتیب و تحشیہ: پروفیسر محمد مسعود احمد مرکزی مجلسِ رضا، لاہور، ۱۹۸۱ء

۴۔ دو اہم فتوے، امام احمد رضا بریلوی اور مولوی اشرف علی تھانوی، ناشر حافظ محمد خاں۔ متعلم جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، ۱۹۷۷ء

۵۔ اندھیرے سے اجالے، محمد عبدالحکیم شرف قادری، مرکزی مجلس رضا، لاہور، ۱۹۸۵ء

۶۔ الطاریُ الدّاری لہفوات عبدالباری (تین حصے) مولفہ محمد مصطفےٰ رضا خاں، اشاعت نو انجمنِ ارشاد المسلمین، لاہور، ۱۹۸۳ء

۷۔ دو قومی نظریہ کے حامی علماء اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، خواجہ رضی حیدر اور حاجی احمد مجاہد، کراچی، ۱۹۸۲ء

۸۔ حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، پروفیسر مسعود احمد، اسلامی کتب خانہ، سیالکوٹ، ۱۹۸۱ء

۹۔ اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولفہ، مقبول جہانگیر، بزم اعلیٰ حضرت، کراچی، ۱۹۸۱ء

۱۰۔ تحریکِ آزادیٔ ہند اور السّواد الاعظم، پروفیسر مسعود احمد، لاہور، اگست ۱۹۸۷ء

پاکستان میں مذکورہ بالا اشاعتوں کے ذریعہ ان کے ناشر اور مرتب یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ فاضل بریلوی نے متحدہ قومیت کے تصور کو تسلیم نہ کرکے 'دو قومی نظریہ' کی بنیاد ڈالی اور اس عمل میں وہ علامہ اقبال اور محمد علی جناح سے سبقت لے گئے۔ فاضل بریلوی اور ترک موالات (مؤلفہ پروفیسر محمد مسعود احمد) میں 'عرض حال' کے عنوان سے عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری مظہری نے اس ضمن میں

جو استدلال پیش کیا ہے وہ قابلِ غور ہے :

اسلام کو ہندو مت میں مدغم کرنے کی تحریک کا منحوس
سہرا، مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے سر ہے۔ اُس دور میں
جب اس منصوبے نے زور پکڑا تو امام ربّانی حضرت مجدّد الف
ثانی سرہندی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے خلاف جہاد کیا اور
دوسری طرف خاتم المحققین شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ
علیہ نے اسلامی تعلیمات کو منضبط کرنے کی بے مثال خدمت
انجام دی تاکہ مسلمان اپنے برحق دین کی تعلیمات سے واقف
ہو کر "فتنۂ دین الٰہی" سے محفوظ و مامون رہ سکیں۔

چودھویں صدی (ہجری) کے اوائل میں انگریزی اقتدار
کے زیر اثر اس تحریک نے پھر زور پکڑا تو مسلمانوں کے کتنے
ہی لیڈر اور علماء اس سازش کے سیلاب میں بہنے لگے
اور اپنے ساتھ سادہ لوح مسلم عوام کو بھی بہا لے گئے۔ مولانا
محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور جناب محمد علی جناح جیسے بیدار مغز
مشاہیر بھی اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔

لیڈر حضرات جو اس اتحاد پر زور دیتے تھے اُن کی
آواز پر تو مسلمانوں نے کان نہ دھرے لیکن اس سازش
کی جڑیں اس وقت مضبوط ہو گئیں جب بہت سے علماء اس
نظریہ کے قائل بلکہ مبلغ بن کر گاندھی کو اپنا امام بنا بیٹھے۔ نوبت

بایں جا رسید کہ ایک مشہور عالم (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) نے یہاں تک کہہ دیا ؎

عمرے کہ بآیات واحادیث گزشت رفتی و نثار بت پرستی کردی

اس پُرفتن عہد میں جب اکبری دور کی فتنہ سامانیوں کی تجدید ہونے لگی تو شیخ احمد سرہندی اور محقق دہلوی رحمہا اللہ کی طرح جس مردِ حق آگاہ نے اس ناپاک منصوبے کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا وہ امام احمد رضا خاں بریلوی تھے۔ مرکزِ دائرۂ علوم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے بھی مسیحائے قوم اور ناخدائے کشتیٔ ملت ثابت ہوئے انھوں نے "دو قومی نظریہ" کو قرآن و حدیث کی روشنی میں خواص و عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس اتحاد کے خلاف عملی اور قلمی دونوں طرح جہاد کیا....

.... اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو "دو قومی نظریہ" کے اس دور میں اوّلین علمبردار فاضل بریلوی ہی تھے۔[۲۱]

فاضل بریلوی کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ 'دو قومی نظریہ'، جو تحریک پاکستان کی اساس بنا تاریخی اعتبار سے اس کے کہیں بعد کا ہے لیکن پاکستان میں اس طرح کی تحریر کی اشاعت کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو جیسا کہ اوپر بتایا گیا یہ کہ اس سے 'نظریۂ پاکستان' کو استحکام ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حالانکہ تحریک پاکستان میں فاضل بریلوی کے تلامذہ اور خلفاء نے صدر الافاضل مولوی سید نعیم الدین کی قیادت

میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں تاہم قیام پاکستان کے بعد ان کی خدمات کو فراموش کر دیا گیا۔ تاریخ نگاروں نے بھی طبقاتی تعصب کا اظہار کیا اور بریلوی علمائ کا ذکر پاکستان کے قیام کی تاریخ میں نہیں ہوا۔ اس احساس نے پاکستان کے بریلوی دانشوروں میں یہ تحریک پیدا کی کہ بریلوی علمار کو 'دو قومی نظریہ' کا حامی بنا کر پیش کیا جائے[۲۲]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فاضل بریلوی کے مشاہیر تلامذہ اور خلفار میں سے بیشتر مسلم لیگ کی ہمنوائی میں مطالبۂ پاکستان میں شریک تھے لیکن خود فاضل بریلوی کا تو اس سے تعلق نہیں بنتا تھا۔ البتہ ہندو مسلم اتحاد سے متعلق ان کے افکار اس سمت میں موڑے جا سکتے ہیں۔ اور موڑے بھی گئے۔

خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں کے مقاصد اور لائحۂ عمل کے سلسلہ میں اِن کے قائدین کے خیالات سے قطعِ نظر یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ بریلوی علمار اِن تحریکوں کے مقاصد اور طریقۂ عمل کے بارے میں کیا سمجھ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ شعائرِ دینی جیسے قربانی گاؤ کو ختم کیا جا رہا ہے۔ اصل مقصد خلافت کی حفاظت نہیں سوراج ہے اور چونکہ ملک کی اکثریت ہندوؤں کی ہے لہٰذا سوراج کا مطلب ہندو راج ہوگا، خلافت مذہبی تحریکوں ہے تو اس کی قیادت ایک مُشرک کے سپرد کیوں کی گئی ہے، مُشرک کو منبر رسول پر کیوں بٹھایا گیا' کیوں مُسلم لیڈروں نے قشقہ لگوایا، اور مُشرک کی ٹکٹکی اُٹھائی۔ بریلوی علمار کو اس بات سے زیادہ تشویش تھی کہ بدایونی اور فرنگی محلی علمار آخر کیوں ان تحریکوں میں ساتھ ہیں جب کہ وہ اُن ہی کی طرح اہلسنت اور حنفی المذہب ہیں۔ اسی لیے فاضل بریلوی نے خاص طور سے مولوی عبدالباری فرنگی محلی کا تعاقب کیا اور بالآخر اُن سے توبہ کروا ہی لی۔

اس توبہ نامہ کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"مجھ سے بہت سے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ، مجھے ان پر ندامت ہے۔ زبانی، تحریری اور عملی طور پر مجھ سے ایسے امور سرزد ہوئے جنھیں میں نے گناہ تصور نہیں کیا تھا۔ لیکن مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی انھیں اسلام سے انحراف یا گمراہی یا قابل مواخذہ خیال کرتے ہیں۔ اُن سب سے میں رجوع کرتا ہوں جن کے لیے پیش روؤں کا کوئی فیصلہ یا نظیر موجود نہیں اُن کے بارے میں میں مولانا احمد رضا خاں کے فیصلوں اور فکر پر کامل اعتماد کا اظہار کرتا ہوں۔"[۲۳]

سیاست میں مذہبی اصطلاحوں کے استعمال نے نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے بہت پریشانیاں کھڑی کیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ان آیات کریمہ پر زور دیا گیا۔ لَا یَنْهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝۸ اِنَّمَا یَنْهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹

(ترجمہ: اللہ تمھیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہ نکالا کہ ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو، بیشک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں۔ اللہ تمھیں اُنہی سے منع کرتا ہے جو تم سے دین میں لڑے

یا تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا یا تمھارے نکالنے پر مدد کی کہ ان سے دوستی کرو اور جو اُن سے دوستی کرے تو وہی ستمگار ہیں۔[9] (الممتحنہ سورۃ ۶۰ آیات ۸ و ۹)

مولانا آزاد نے ان آیات پر خصوصی طور پر توجہ کی۔ آگرہ میں مجلس خلافت منعقدہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے انھوں نے واضح کیا کہ ترکِ موالات کے ضمن میں قرآن کے کیا احکام ہیں: "موالات ولایت سے ہے۔ ولایت کے معنی ہیں محبت، اعانت اور نصرت کے۔ تو ترکِ موالات کے معنی ہوئے مددگاری کے ہر طرح کے تعلقات کو منقطع کر لینا۔ جب تک وہ جماعت اپنے ظلم سے باز نہ آئے۔ اس حکم کی بنا پر قرآن مجید نے تمام قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ چنانچہ اس کی تقسیم سورۂ ممتحنہ میں کر دی ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ دو قسم کی قومیں دنیا میں پیش ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں، مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں کہ نہ تو جنھوں نے حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی قوموں کے لیے ایک لمحہ کے لیے قرآن مسلمان کو نہیں روکتا کہ اُن کے ساتھ وہ مصالحت نہ کریں اور بہتر سے بہتر اچھے سے اچھا سلوک نہ کریں لیکن جن غیر مسلمان قوموں کے ساتھ قتال کریں، مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں۔ ایسی غیر مسلمان قوموں کی نسبت بلاشبہ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے جائیں ..... قرآن مجید کا یہ اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی ایسا تعلق، جو محبت، دوستی، صلح، وفاداری کا ہو اور ہر طرح کی اعانت و نصرت کا ہو نہیں رکھ سکتا ہے"[24]

اسی خطبۂ صدارت میں آگے چل کر مولانا آزاد نے سورۂ ممتحنہ کی رو سے
برٹش گورنمنٹ کو مسلمانوں کے مقابلے میں فریق محارب ثابت کرتے ہوئے کہا:

مسلمانوں کے لیے یہ قریب قریب کفر ہوگیا ہے کہ وہ
برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت،
وفاداری اور اطاعت کا کوئی تعلق رکھیں۔ اور اگر وہ کوئی تعلق
اس طرح کا رکھیں گے تو ایک منٹ کے لیے ان کو یہ حق نہ ہوگا
کہ وہ اپنے کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔ قرآن نے کہا
ہے کہ جو مسلمان ایسے وقتوں اور ایسی حالتوں میں محارب قوم
کے ساتھ رشتۂ موالات رکھے گا۔ اگرچہ وہ زمین میں اپنے آپ
کو مسلمان کہے لیکن اللہ کے نزدیک اُس کا شمار مومنوں میں نہ
ہوگا، کفار میں ہوگا۔[۲۵]

اس طرح کے فتوے کا جواب بریلوی حلقہ سے دیا جانا ضروری تھا کیوں کہ
مولانا آزاد کی بات سے انکار کی صورت میں معاملہ تکفیر پر ختم ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں
فاضل بریلوی کا فتویٰ المحجۃ المؤتمنہ فی آیۃ الممتحنہ (۱۳۳۹ھ) رسالہ کی شکل میں شائع ہوا
جس میں دلائل سے ثابت کیا گیا کہ ہندوستان کے مشرکین، حربی کفار ہیں ان سے
وداد و اتحاد اس آیت کریمہ کے تحت نہیں آتا۔[۲۶]

فاضل بریلوی کے تلمیذ اور خلیفہ محمد سلیمان اشرف نے اس موضوع پر طویل
بحث کی جس کا خلاصہ انھوں نے یہ پیش کیا:

(۱) کافر کے ساتھ دلی دوستی اور قلبی محبت کفر ہے۔

(۲) دل میں کافر کی دوستی نہیں لیکن عمل دوستوں کے مانند و مثل یہ حرام ہے۔

(۳) قلب محبت کفر و کفار سے پاک بلکہ بیزار لیکن کافر کے مذہبی اعمال میں عملاً شرکت کی جائے یہ حرام ہے۔

(۴) کافر کے دین کی حمایت حرام ہے۔

(۵) کافر کی ایسی مدد کرنا جس سے دین اسلام یا مسلمانوں کا نقصان ہوتا ہو حرام ہے۔

(۶) کافر سے ایسی مدد لینا جس میں اپنے دین یا اپنے دینی بھائیوں کا نقصان ہوتا ہو حرام ہے۔

(۷) مدارات فعل جمیل عمل معروف بر و احسان اور عدل و انصاف ہر حال میں جائز ہیں بلکہ بعض کفار کے ساتھ احسن و انسب۔

(۸) دنیاوی کاروبار اور لین دین ہر کافر حربی اور غیر حربی سے جائز۔ کسی بھی وقت حرام نہیں۔

(۹) ان احکام میں کفار ہند اور کفار یورپ سب مساوی ہیں۔ بجز اس کے کہ کفار اہلِ کتاب کا کھانا کھانا اور نکاح میں کتابیہ عورت کا لانا بموجب حکم قرآن پاک مباح و جائز ہے اس کے سوا جملہ احکام شرعیہ کفار اہلِ کتاب و کفار غیر اہلِ کتاب دونوں کے لیے یکساں ہیں[۲۲]

مولانا سلیمان اشرف نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دراصل 'مفتیانِ سیاسی' نے سورۃ الممتحنہ کی تشریح کے سلسلہ میں بڑی خیانت سے کام لیا ہے۔ اگر ہم اس سلسلہ میں مولانا آزاد کے اوپر ذکر کیے گئے خیالات کو ذہن میں رکھیں تو 'سیاسی مفتیان' سے مولانا سلیمان اشرف کا اشارہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"موالات کے سیاسی مفتیوں نے دو ترجمے کیے ہیں ایک محبت و دوستی اور دوسرا مناصرۃ (یعنی مدد دینا یا مدد لینا) مفتیان سیاسی مناصرۃ سے مطلق مدد دینا یا لینا ارادہ کرتے ہیں تاکہ نان کوآپریشن کے حدود دائرۂ شریعت میں آجائیں اور یہی اُن کی خیانت ہے۔ موالات جب مناصرۃ کے معنی میں لیا جائے گا تو وہاں نصرۃ علی المومنین مراد ہوگا یعنی ایسی مدد جس سے مسلمانوں کا نقصان ہوتا ہو یا نصرۃ الکفر مراد ہے یعنی کفر کی مدد۔"[۲۸] البتہ مولانا سلیمان اشرف یہ واضح کرتے ہیں کہ "معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی امور میں مناصرۃ ہرگز ہرگز ممنوع نہیں۔"[۲۹]

مولانا سلیمان اشرف یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مفتیان سیاسی درحقیقت کفار ہند سے موالات پیدا کرنے کی خاطر یہ فریب آمیز مغالطہ پیش کر رہے ہیں۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ "آیاتِ الٰہیہ پکار پکار کر یہ حکم دے رہی ہیں کہ مطلقاً کفار سے موالات اور وداد حرام ہے۔"[۳۰] وہ کسی قدر حوصلہ کر کے یہ بھی کہتے ہیں کہ "موالات یا مناصرۃ کے اگر یہ معنی جو مفتیان سیاسی اختراع کر رہے ہیں لیے جائیں تو نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ یہ لازم آتا ہے کہ خود صاحب وحی و کتاب شارع علیہ السلام نے کفار سے یہود سے بطرز گوناگوں موالات پیدا کی۔"[۳۱]

ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کی خاطر آیات قرآنی کا سہارا لینے کے علاوہ بعض ایسے عملی اقدامات بھی کیے جا رہے تھے اور اقوال کہے جا رہے تھے جن پر بریلی مکتب کے علماء کو سخت اعتراض تھا۔ انھوں نے ان اقدامات اور اقوال کو خلاف دین ثابت کیا اور یہ بتایا کہ ہندو مسلم اتحاد مسلمانانِ ہند کو کس طرف لے جا رہا تھا۔ فاضل بریلوی نے اپنے رسالہ المحجۃ المؤتمنہ فی آیۃ الممتحنہ میں ان امور کی نشاندہی کی جن سے اُن کی نظر میں

دین کی خلاف ورزی ہوتی تھی :

(۱) گائے کا گوشت کھانا گناہ ٹھہراؤ، کھانے والوں کو کمینہ بتاؤ۔

(۲) خدا کی قسم کی جگہ رام دوہائی گاؤ۔

(۳) قرآن مجید کو رامائن کے ساتھ ایک ڈولے میں رکھ کر مندر میں لے جاؤ۔ دونوں کی پوجا کرو۔

(۴) نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے۔

(۵) ہم ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہیں جو ہندو مسلم کا امتیاز اٹھا دے گا۔

(۶) دوسرا جمعہ کا خطبہ اُردو میں پڑھتا ہے اور اس میں خلفائے راشدین، حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بجائے گاندھی جی کی مدح "مقدس ذات" "ستودہ صفات" وغیرہا لفظوں کے ساتھ گاتا ہے۔[۳۲]

بریلی مکتب فکر کے دوسرے علماء بھی ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہونے والی صورت حال سے متفکر اور متنفر تھے۔ فاضل بریلوی کے خلیفہ مولانا سلیمان اشرف، استاد دینیات ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ نے بھی اپنے رسالے الرشاد میں ان امور کا ذکر فرمایا جنھیں وہ خلاف مذہب سمجھتے تھے :

(۱) ہندو لیڈروں کو مساجد میں لے گئے، منبروں پر بٹھایا۔

(۲) مسلمان مندروں میں گئے، وہاں دعائیں کیں، قشقہ لگوایا۔

(۳) گاندھی جی کے حکم سے ستیہ گرہ کے دن روزہ رکھا۔

(۴) وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا۔

(۵) کرشن جی کو حضرت موسیٰ کا لقب مان لیا گیا۔

(۶) بدایوں کے ایک جلسے میں ایک ہندو مقرر نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان رام لیلا مناٸیں، ہندو محرم مناٸیں[۴۳]

مولانا محمد سلیمان اشرف نے مسلمانوں کی اس روش پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے یہ رباعی فارسی میں تحریر فرماٸی:

دارم دلکے غمیں، بیامرز و مپرس
صد واقعہ درکمیں، بیامرز و مپرس
شرمندہ شوم اگر بپرسی عملم
یا اکرم الاکرمیں، بیامرز و مپرس[۴۴]

بریلی مکتب ہی کے مولانا محمد میاں قادری مارہروی نے تحریک خلافت کے مدمقابل بریلوی تنظیم 'انصار الاسلام' کے جلسے منعقدہ بریلی ۲۲ر شعبان ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں اپنے صدارتی خطبے میں اُن امور کی طرف اشارہ کیا جو ہندو مسلم اتحاد کے مدعیان کے رہین منت تھے:

۱۔ قشقہ لگوانا۔
۲۔ مشرکوں کی جے پکارنا۔
۳۔ رام لچھمن پر پھول چڑھانا۔
۴۔ رامائن کی پوجا میں شریک ہونا۔
۵۔ ارتھی کندھوں پر اُٹھا کر مرگھٹ لے جانا۔
۶۔ مشرک میت کے لیے دعائے مغفرت کرنا اور وہ بھی مسجد میں۔
۷۔ مسجدوں میں مشرکوں کی تعزیت کے جلسے کرنا۔

۸۔ اللہ کو رام کہنا۔

۹۔ خطبہ جمعہ میں مشرک کی تعریف کرنا۔

۱۰۔ دسہرے میں شریک ہونا۔

۱۱۔ سنکھ بجانا۔

۱۲۔ قربانی گاؤ کو بھینٹ چڑھانا۔

۱۳۔ قاتل مشرکوں کی رہائی کی کوشش کرنا۔

۱۴۔ قربانی کی گائے زبردستی چھین کر اس کو گئو شالہ پہنچانا۔[۳۵]

مولانا محمد میاں نے مندرجہ ذیل رباعیات میں ہندو مسلم اتحاد کے مدعیان کی کوششوں کا ذکر اس طرح کیا ہے :

یہ لیڈر یہی سوچا کرتے ہیں چالیں ۔۔۔ کہ اک مذہب ایسا نیا یہ نکالیں
مسلمان و مشرک کو جس سے ملادیں ۔۔۔ جو ہے باہمی فرق اُس کو مٹادیں
ہے پریاگ و سنگم بتوں کا جو معبد ۔۔۔ مقدس بنائیں اُسے، ہے یہ مقصد

. . .

مسلماں خلافت کی کرلیں گے خدمت ۔۔۔ ہمیں تو ہے بس ہندوؤں سے محبت
انھیں آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے خلافت ۔۔۔ تو ہم خوب اس کی بنائیں گے دُرگت
خلیفہ اگر ہندوؤں سے لڑیں گے ۔۔۔ تو اک ہندو کے بدلے ہم دس کٹیں گے

ایسا نہیں ہے کہ مولانا آزاد سیاسی معاملات میں مذہبی اصطلاحوں اور استعاروں کے استعمال سے پیدا ہونے والے خطرات سے واقف نہیں تھے۔ ایسا موقع بھی آیا تھا جب مارچ ۱۹۲۱ء میں بریلی میں جمیعت علماء ہند کا ایک کھلا جلسہ خود مولانا

آزاد کی زیر صدارت منعقد ہوا اور اُس میں جماعت رضائے مصطفےٰ کے مولویوں نے اُن کا خوب ڈٹ کر مواخذہ کیا اور مولانا بے بس ہو گئے۔[۳۶] اس جلسہ کے سلسلہ میں جو اشتہارات شائع ہوئے تھے اُن میں اعلان کیا گیا تھا کہ مخالفین پر اتمام حجت کیا جائے گا. جواباً تلمیذ فاضل بریلوی صدرالشریعہ مولانا امجد علی کے مرتب کردہ ستر سوالات بعنوان "اتمام حجت نامہ" شائع کر کے خلافت کمیٹی تک پہنچا دیے گئے۔ مولانا آزاد نے فاضل بریلوی کو جلسہ میں شرکت اور رفع منازعت کی دعوت دی۔ لیکن اس سے پہلے ہی 'جماعت رضائے مصطفےٰ' کی طرف سے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس میں شرکت کرنے اور رفع نزاع کے لیے ایک وفد کا اعلان اشتہار کے ذریعہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ وفد جس میں مولانا امجد علی، مولانا نعیم الدین مرادآبادی اور مفتی محمد برہان الحق شامل تھے اور جس کی قیادت مولٰینا سلیمان اشرف کر رہے تھے جلسہ گاہ پہنچ گیا۔ اسٹیج پر مولٰینا آزاد کے علاوہ مولانا نثار احمد کانپوری، مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مولوی احمد سعید دہلوی موجود تھے۔ وفد کے صدر مولانا سلیمان اشرف کو مولانا آزاد نے تقریر کا موقع دیا۔ تقریر کے دوران انھوں نے اپنے موقف کی وضاحت کی، ستر سوالوں کے جواب طلب کیے اور مولانا آزاد کے کچھ اخباری بیانات، کچھ تقریروں اور بعض حرکات پر شدید اعتراضات کیے۔ مولانا آزاد نے جوابی تقریر میں کہا:

"کچھ مولویوں کا وفد آیا ہے جس کا نہ کوئی اصول ہے اور نہ مقصد، مجھ پر جو الزامات لگائے جا رہے ہیں سب غلط اور بے بنیاد ہیں، جن کا کوئی ثبوت نہیں۔"

اس کے بعد مولانا آزاد نے جماعت رضائے مصطفےٰ کے اراکین وفد سے کہا کہ وہ جا سکتے ہیں۔ مفتی برہان الحق (پیدائش ۱۸۹۲ء) جو مولانا آزاد سے تین چار

سال ہی چھوٹے تھے کسی طرح موقع پاکر مولانا آزاد سے کچھ سوالات کر لیے اس کی روئداد خود مفتی برہان الحق کے الفاظ میں یہاں نقل کی جا رہی ہے۔ انھوں نے مولانا آزاد سے "ذرا بلند آواز سے کہا":

آنجناب نے ابھی ابھی اپنی جوابی تقریر میں زور دے کر فرمایا کہ مجھ پر تمام الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں۔ میری گذارش یہ ہے کہ اخبار زمیندار، لاہور کے فلاں نمبر، فلاں تاریخ میں، نہایت جلی سرخیوں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ "ناگپور کے خلافت کانفرنس کے پنڈال میں، امام الہند ابوالکلام آزاد صاحب نے جمعہ پڑھایا اور خطبۂ جمعہ میں مہاتما گاندھی کی صداقت وحقانیت کی شہادت دی"— ایک مشرک کی صداقت وحقانیت کی شہادت خطبۂ جمعہ میں!— یہ کیسا اسلام ہے؟!"

یہ سنتے ہی بقول مفتی برہان الحق مولانا آزاد کا چہرہ فق ہو گیا۔ ایک دو منٹ تک انھیں دیکھتے ہی رہے اور پھر بولے:

"لعنۃ اللہ علی قائلہ"

ایک اور سوال جو مفتی برہان الحق نے کیا وہ یہ تھا کہ "اخبار تاج (جبل پور) فلاں تاریخ، فلاں نمبر میں ہے کہ "الٰہ آباد کے ایک جلسۂ عام میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے کرسئ صدارت سے اعلان فرمایا کہ مقاماتِ مقدسہ کا فیصلہ

اگرچہ ہمارے حسبِ دلخواہ بھی ہو جائے تب بھی ہم اس وقت تک چین نہ لیں گے، جب تک گنگا اور جمنا کی مقدس سرزمین کو آزاد نہ کرالیں گے۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے گنگا جمنا بھی آپ کے نزدیک مقدس ہیں؟ استغفر اللہ۔"

اس پر مولانا آزاد نے کہا: "میں نے پرچے نہیں دیکھے، لعنۃ اللہ علی قائلہ"

مولانا آزاد سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی توبہ کے الفاظ اخبارات میں شائع کرائیں۔ مولانا آزاد نے وعدہ کیا کہ اجلاس کی روداد میں ان تمام غیر اسلامی حرکات سے رجوع کا اعلان شائع کردیا جائے گا۔ جلسہ کا اختتام شب میں کسی وقت ہوا ہوگا۔ بریلی اسٹیشن پر روانگی کے وقت مولانا آزاد نے اُس مجمع سے جو اُنھیں گھیرے ہوئے تھا کہا:

بعض باتیں حقیقت ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اب ہمیں آزادی کا جو مسئلہ حل کرنا ہے اس کے آگے اب تمام باتیں فی الحال زیادہ توجہ کے قابل نہیں ہیں مگر احتیاط بہرحال ضروری ہے۔

ایک صاحب جو اسٹیشن پر بسکٹ بیچتے تھے انھوں نے یہ روئداد بیان کی۔

خلافت کے سلسلے میں 'موالات' کے علاوہ ایک اور مسئلہ جو زیرِ بحث آیا وہ تھا کہ آیا خلافت شرعیہ کے لیے قرشی ہونا شرط ہے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا آزاد اسے "قرشیت" کو خلیفہ کے لیے لازمی نہیں مانتے تھے جبکہ فاضل بریلوی شرعی نقطۂ نظر سے قرشیت کو خلیفہ کے لیے لازمی شرط قرار دیتے تھے۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک رسالہ بھی قلمبند کیا تھا دوامُ العیش فی الائمۃ من قریش درا صل اس کی تالیف

کا موجب ایک استفتا تھا جو ۱۹۲۰ء میں اُنھیں موصول ہوا۔ اس میں تین سوال کیے گئے تھے جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ مسلمانوں پر سلطنت عثمانیہ کی اعانت لازم ہے کہ نہیں؟

۲۔ فرضیتِ اعانت کے لیے سلطان کا قرشی ہونا یا خلیفہ شرعی ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

۳۔ ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نزدیک خلافتِ شرعیہ کے لیے "قرشیت" شرط نہیں، یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟[۳۳]

پہلے اور دوسرے سوالات کے جواب میں فاضل بریلوی نے لکھا:

"سلطنت علیہ عثمانیہ ایدھا اللہ تعالیٰ نہ صرف عثمانیہ، ہر سلطنتِ اسلام، نہ صرف سلطنت، ہر جماعت مسلمان، نہ صرف جماعت، ہر فردِ اسلام کی خیر خواہی، ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس میں "قرشیت" شرط ہونا کیا معنی؟ دل سے خیر خواہی مطلقاً فرض عین ہے۔"[۳۴]

تیسرے سوال کا جواب اس طرح دیا:

"البتہ اہلسنت کے مذہب میں خلافت شرعیہ کے لیے ضرور "قرشیت" شرط ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر حدیثیں ہیں، اسی پر صحابہ کا اجماع ہے... مگر شرعاً خلیفہ یا امیر المومنین... ہر بادشاہ قرشی کو بھی نہیں کہہ سکتے، سوا اس کے جو ساتوں شرط خلافت اسلام، عقل، بلوغ، حریت، ذکورت، قدرت، قرشیت سب کا جامع ہو کر تمام مسلمانوں کا

فرماں روائے اعظم ہو" [۳۹]

یہ رسالہ ۱۹۲۱ء میں لکھا گیا اور فاضل بریلوی کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادہ مفتئ اعظم محمد مصطفیٰ رضا خاں نے اپنی تمہید کے ساتھ ۱۹۲۲ء میں بریلی سے شائع کیا جبکہ حکومت سلطانی معدوم ہو چکی تھی۔ اس رسالے کی اشاعت کو التواء میں کیوں رکھا گیا اس کی وضاحت مفتئ اعظم نے تمہید میں اس طرح کی ہے:

دار الافتاء میں سوال آیا کیے اور ہم معرض التواء میں رکھا کیے۔ محض اس خیال سے کہ شاید اس جھوٹے نام خلافت ہی سے ہمارے ترک بھائیوں کو کچھ فائدہ ہو جائے۔ اس وقت ایسے استفتار کا جواب نہ دینا بہتر ہے مگر جب فرنگی محل سے بار بار تقاضے آئے تو یہ جواب دے دیا گیا کہ ایسے مسائل اس دار الافتاء کے موضوع سے خارج ہیں ... (اس جواب کی) اشاعت کر کے اور ساتھ ہی یہ ظاہر کر کے کہ دار الافتائے بریلی اس میں مخالف ہے انگریزوں کو جتا دیا کہ یہ مسئلہ اتفاقی نہیں وہ مسلمان جو آج ایک عالم کے معتمد علیہ اور عرب وعجم کے مرجع ہیں اس میں مخالف ہیں پھر بھی یہاں سے کچھ نہ کہا گیا... شروع ۳۹ھ میں فرنگی محلی خطبہ اور آزادی رسالہ جزیرۃ العرب کے خیالات خام و باطل اوہام کے متعلق استفتار کے جواب میں حضور پر نور اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک رسالہ دوام العیش فی الائمۃ من قریش تصنیف فرمایا... اسے اس خیال سے چھوڑ دیا کہ ابھی اس کا

وقت نہیں آیا جب وقت آئے گا تکمیل کر کے طبع کرا دیا جائے گا۔"[۴۰]

فاضل بریلوی نے اس رسالہ کو ایک مقدمہ اور تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ فصل دوم خاص طور سے مولوی فرنگی محلی کے خطبۂ صدارت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور فصل سوم میں جیسا کہ اس کا عنوان ہے "رسالۂ خلافت میں مسٹر ابوالکلام آزاد کی تلبیسات و ہذیانات کی خدمت گزاری کی گئی ہے۔" اس رسالے میں اکثر مقامات پر فاضل بریلوی نے مولانا عبدالباری اور مولانا آزاد کے اپنے موقف میں پیش کیے گئے دلائل پر علمی بحث کی ہے اور اُن کی لغزشوں کی جا بجا نشاندہی کی ہے۔ طنز و طعن سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی محفوظ نہیں رہے ہیں لیکن مولانا آزاد کا محاسبہ زیادہ سختی سے کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ فاضل بریلوی مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو تو علماء میں شمار کرتے تھے، مگر ابوالکلام آزاد کو خاطر میں نہ لاتے تھے جس کا اندازہ اُن کے اس جملے سے کیا جا سکتا ہے:

"کسی پرچۂ اخبار کی ایڈیٹری اور چیز ہے اور حدیث و فقہ کا سمجھنا اور۔ وہ "مِن" کا ترجمہ "سے" اور "اِلیٰ" کا ترجمہ "تک" کر لینے سے نہیں آتا۔"[۴۱]

اس کے علاوہ فاضل بریلوی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ خلافتِ اسلامیہ کی حفاظت محض دکھاوا اور ایک آڑ ہے۔ اصل مقصود سوراج ہے۔ جہاں تک مولانا آزاد کا سوال ہے انھوں نے خود کہا ہے:

"مسئلۂ خلافت کا اصلی حل ہندوستان کی آزادی پر موقوف تھا۔ اس لیے تحریکِ خلافت نے خود بخود ملک کو تحریک

آزادی تک پہنچادیا۔"[۴۲]

مولانا آزاد کے مندرجہ ذیل خیالات سے فاضل بریلوی کے اندیشوں کی مزید تائید ہوئی:

"کوشش اور لڑائی صرف اماکن مقدسہ اور خلافت کے لیے نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کو خود اختیاری حکومت دینے کے لیے ہے۔ اگر خلافت کا خاطر خواہ فیصلہ ہو بھی جائے تاہم ہماری جدوجہد جاری رہے گی، اس وقت تک کہ ہم گنگا و جمنا کی مقدس سرزمین کو آزاد نہ کرالیں۔"[۴۳]

فاضل بریلوی نے اس عبارت پر گرفت کرتے ہوئے لکھا:

ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے، اصل مقصد بغلامی ہنود سوراج کی چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کردی ہے۔ بھاری بھرکم خلافت کا نام لو، عوام بپھریں، چندہ خوب ملے اور گنگا و جمنا کی مقدس زمینیں" آزاد کرنے کا کام چلے۔

اے پسرِ مشرکان بزمزم نرسی
کین رہ کہ تو میروی بہ گنگ و جمن است[۴۴]

مولانا آزاد جس آن بان سے قومی سیاست میں نظر آرہے تھے اُن کی تحریروں اور تقریروں میں جو خطیبانہ طرز تھا اُس سے اُن کی قیادت کے عزائم کا اظہار ہوتا تھا۔ فاضل بریلوی کی نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی۔ لکھتے ہیں:

"مسٹر آزاد اگرچہ اپنے نشے میں تمام ائمۂ مجتہدین کرام سے
اپنے آپ کو اعلیٰ جانتے ہیں، ان کے ارشادات کو ظنی اور اپنے
توہمات کو وحی سے مکتسب قطعی مانتے ہیں اور سلطان کا نام
محض دکھاوا ہے۔ تمام امت سے اپنی امامت مطلقہ منوانے
کا دعویٰ ہے۔ دیکھو رسالۂ خلافت کا اخیر مضمون ۱ھد کم
سبیل الرشاد (میرے پیرو ہو جاؤ) میں تمھیں راہِ حق کی ہدایت
کروں گا۔"[۴۵]

دوام العیش کے مقدمہ میں ایک جگہ مولانا آزاد کی ایک تحریر کا تعاقب کرنے کے
بعد کہتے ہیں "خدا جانے مسٹر آزاد یہ کس جنگ یا کسی نشے کی ترنگ میں لکھ گئے۔"[۴۶]
اسی رسالہ کی فصل سوم کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں: "یہ ۳۵ ردِ قاہر خطبہ
صدارت فرنگی محلی کی ۱۵ سطری تحریر پر قلم برداشتہ تھے اب بعونہ تعالیٰ چار حرف
ان کے بڑے آزاد لیڈر صاحب کی تحریر پر بھی گزارش ہوں..."[۴۷] انھیں مسٹر آزاد کے خیالات
پر خارجیوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "مسٹر آزاد نے بڑا زور اس پر دیا ہے
کہ اسلام تو قومی امتیاز کے اوٹھانے کو آیا ہے پھر وہ خلافت کو قریش کے لیے کیسے خاص
کر سکتا۔ یہ اعتراض مسٹر آزاد کا طبعزاد نہیں خارجی خبیثوں سے سیکھا ہے۔"[۴۸] فصل سوم
میں ایک مبحث کا عنوان فاضل بریلوی نے "ردِ احادیث نبوی میں مسٹر کی بے سود کوشش"
رکھا ہے۔ اس مبحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں "غرض پیشگوئی بتا کر تکذیب حدیث کے سوا
مسٹر کو کچھ مفر نہیں۔"[۴۹] دوسری جگہ لکھتے ہیں "مسٹر نے یوہیں دوسری حدیث الائمۃ من قریش
سے تشریع اوڑانے اور نری خبر بنانے کے لیے کیا کیا ڈوبتے سوار پکڑے ہیں۔"[۵۰] اس مبحث

کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ ہے مسٹر کی حدیث دانی اور ارشاداتِ نبوت پر ظلم رانی"[۵۱]

"زہے مسٹری و لیڈری و ایڈیٹری" اہلسنت وجماعت اور تقلید کے اصول سے

منحرف ہونے کے بعد 'امام الہند' (بقول بریلوی علماء امام الھنود) کو اسی طرح کے طنز و استہزاء

کا نشانہ بننا پڑا۔ یہی نہیں فاضل بریلوی نے تو مولانا آزاد کو پوری طرح مسترد کر دیا تھا

جیسا کہ اُن کی ذیل کی فارسی رباعی سے ظاہر ہوتا ہے:

آزاد مگر نہ تو بیشک مشرک ۔۔۔ دہ مسلم می دہی پئے یک مشرک

زاسلامت اگر بہرہ بدے میکردے ۔۔۔ برناخن مسلمے خدا لک مشرک[۵۲]

حواشی

۱ء دوام العیش فی الائمۃ من قریش، احمد رضا خاں، مکتبہ رضویہ، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۹۵

۲ء آزاد کی کہانی خود اُن کی زبانی بہ روایت، ملیح آبادی، دلّی، اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۶۶

۳ء ایضاً ص ۴۴

۴ء امام احمد رضا کا شجرۂ طوبیٰ، یٰسں اختر مصباحی، حجاز جدید (ماہنامہ) دہلی، جولائی ۱۹۸۹ء، ص ۵۳

۵ء آزاد کی کہانی.... ص ص ۱۴۲-۱۴۱

۶ء حجاز جدید، جولائی ۱۹۸۹ء، ص ۵۵

۷ء حجاز جدید، جنوری ۱۹۸۹ء اداریہ، ص ۸

۸ء آزاد کی کہانی.... ص ۵۶

۹ء ایضاً، ص ۵۶

۱۰ه ایضاً، ص ۵۶

۱۱ه حجازِ جدید، جون ۱۹۸۹ء ص ۵

۱۲ه دی دیوبند اسکول اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان، ضیاء الحسن فاروقی، نئی دہلی ۱۹۶۳ء، ص ۲۵

۱۳ه ہجوم، خصوصی شمارہ، امام احمد رضا نمبر، ۲ر دسمبر - ۸ر دسمبر ۱۹۸۸ء، بحوالہ ہفت روزہ خطیب (دہلی) مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۹۱۵ء

۱۴ه آزاد کی کہانی ..... ص ۱۶۴

۱۵ه ایضاً، ص ۱۶۶

۱۶ه ایضاً، ص ۱۶۶

۱۷ه ایضاً، ص ۳۶۱

۱۸ه ایضاً، ص ۳۶۳

۱۹ه ایضاً، ص ص ۳۷۰-۳۶۹

۲۰ه ایضاً، ص ۳۷۰

۲۱ه عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری کے یہ خیالات ان کے مضمون 'عرض حال' میں موجود ہیں۔ دیکھیے فاضل بریلوی اور ترک موالات، مرتبہ پروفیسر محمد مسعود احمد، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ص ۴-۳

۲۲ه دیکھیے رسالہ دو قومی نظریہ کے حامی علماء اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ادارت، خواجہ رضی حیدر و حاجی احمد مجاہد، کراچی، ۱۹۸۲ء۔ ص ص ۳۷-۷

۲۳ه ایضاً، ص ۱۳

۲۴ه خطبات آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد، اردو کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۹ء ص ص ۳۶-۳۵

۲۵ه ایضاً، ص ۳۷

۲۶ھ اکرام امام احمد رضا، مفتی محمد برہان الحق جبلپوری، ترتیب و تحشیہ: پروفیسر محمد مسعود احمد، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۵

۲۷ھ النور، محمد سلیمان اشرف، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص ۱۰۴

۲۸ھ ایضاً، ص ص ۱۱۹-۱۱۸

۲۹ھ ایضاً، ص ۱۱۹

۳۰ھ ایضاً، ص ۱۱۹

۳۱ھ ایضاً، ص ۱۱۹

۳۲ھ تحریکِ آزادی ہند اور السواد الاعظم، پروفیسر محمد مسعود احمد، لاہور، اگست ۱۹۸۷ء، ص ص ۱۳۳-۱۳۲

۳۳ھ ایضاً ۱۳۳

۳۴ھ ایضاً، حاشیہ ۲، ص ۱۳۳

۳۵ھ ایضاً، ص ۱۳۴

۳۶ھ اس جلسہ کی مکمل روئداد کے لیے دیکھیے اکرام امام احمد رضا، مفتی محمد برہان الحق، ص ص ۱۱۰-۱۰۴

۳۷ھ دوام العیش، افتتاحیہ از پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ص ۶

۳۸ھ ایضاً افتتاحیہ، ص ۶

۳۹ھ ایضاً، افتتاحیہ، ص ص ۷-۶

۴۰ھ تمہید از مفتی اعظم محمد مصطفےٰ رضا خاں، ص ص ۴۲-۴۱

۴۱ھ ایضاً، افتتاحیہ، ص ۹

۴۲ھ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفتہ وار پیغام، مرتبہ: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، پٹنہ، ۱۹۸۹ء ہفتہ وار پیغام، نمبر ۱، جلد ۱، جمعہ، ۲۰ محرم الحرام، ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء، ص ۶

۴۳ه دوام العیش، افتتاحیہ، ص ۱۷

۴۴ه ایضاً، افتتاحیہ، ص ۱۷

۴۵ه ایضاً، افتتاحیہ، ص ۱۹

۴۶ه دوام العیش، ص ۴۹

۴۷ه ایضاً، ص ۹۵

۴۸ه ایضاً، ص ۹۶

۴۹ه ایضاً، ص ۱۰۳

۵۰ه ایضاً، ص ۱۰۴

۵۱ه ایضاً۔

۵۲ه حدائق بخشش، حصہ سوم (مرتب) مولانا محبوب علی خاں قادری رضوی، نابھ (پنجاب)، ۲۹؍ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ، ص ص ۹۳-۹۲
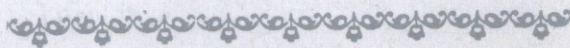
مقالہ دوم

پروفیسر ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم

"اس صدی کے شروع میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے اور ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کے لیے تین آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک اقبال کی "بانگ درا" ایک محمد علی کا "نعرۂ تکبیر" اور ایک ابوالکلام آزاد کا "رجز حریت" ممکن ہے لفظوں کے پرستاروں کو ان تینوں کے پیغاموں میں فرق معلوم ہوتا ہو مگر معنی کے محرم تینوں کی زبان سے ایک ہی بات سنتے اور اس کا ایک ہی مطلب سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دین کی کنجی سے دنیا کے دروازے کھولو، اور اسلام کے اسم اعظم سے آفاق کی تسخیر کرو۔" [۱]

ڈاکٹر عابد حسین کا یہ قول اگر حق و صداقت کا آئینہ دار ہے تو یہ بھی اپنی جگہ مسلّم اور مبنی برحقیقت ہے ایک چوتھی بھی آواز ہے جس نے عالم اسلام میں مذہبی انقلاب برپا کر دیا اور کفر وارتداد کی آندھی میں حق و صداقت کا پرچم اسی طرح بلند رکھا جس طرح باطل کے ظلم واستبداد کی پرواکیے بغیر عہد عباسی میں امام احمد بن حنبل اور دور اکبری میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہما نے بلند کر رکھا تھا وہ آواز تھی اس ذاتِ گرامی کی جو دنیائے علم وادب میں "امام" عالم عرب میں "فاضل بریلوی" اور حلقہ معتقدین ومتوسلین میں "اعلیٰ حضرت" سے متعارف ہے۔ فاضل بریلوی اپنے کارناموں کے سبب رہتی دنیا تک (ان شاء اللہ) اپنی عبقریت کا اعتراف کرواتے رہیں گے۔ متعصب مورخین ان پر دھول تو ڈال سکتے ہیں مگر صفحۂ ہستی سے ان کا نام نسیا منسیاً نہیں کر سکتے۔

امام احمد رضا اور مذکورہ بالا تینوں اساطین علم و ادب کا کسی بھی میدان میں کوئی مقابلہ نہیں کیونکہ امام احمد رضا ذرہٗ فضل و کمال پر اسی وقت پہنچ چکے تھے جب یہ تینوں لوگ بحر علم و فن کی غواصی کا ارادہ کر رہے ہوں گے۔ اسی لیے یہاں میدان علم و ادب میں امام احمد رضا کی شخصیت سے کسی کا موازنہ نہیں البتہ مولانا ابو الکلام آزاد جو سیاست کی بلندیوں پر فائز تھے اور بزعم خویش انہوں نے اس میدان میں ایک بھاری جمعیت کو اپنے پیچھے چھوڑ رکھا تھا اس مقالہ میں ان کی سیاسی بصیرت سے متعلق کچھ گفتگو مقصود ہے۔

امام احمد رضا اگرچہ زندگی بھر اصلاح عقائد اور مذہب باطلہ کی تردید میں لگے رہے لیکن ساتھ ہی انہوں نے علم و ادب اور ملکی حالات و معاملات میں جو حصہ لیا اور جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا وہ ملکی آزادی کے خواہاں تھے اس لیے انہیں انگریزوں سے عداوت و نفرت تھی۔ بقول سید الطاف علی بریلوی۔

"سیاسی نظریہ کے اعتبار سے حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بلاشبہ حریت پسند تھے انگریز اور انگریزی حکومت سے دلی نفرت تھی"۔ [۲]

امام احمد رضا کی طرح مولانا ابو الکلام آزاد بھی غلامی کی زنجیروں سے نکل کر آزادانہ زندگی بسر کرنے کے خواہاں تھے اس لیے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، یہی وہ جذبہ حریت ہے جس نے ابو الکلام آزاد کو عظمت و بلندی کے اس مقام پر کھڑا کر دیا ہے جس کا احساس تو کیا جاسکتا ہے مگر وہاں تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں یہی حریت پسندی ہے جو امام احمد رضا اور مولانا ابو الکلام آزاد کے درمیان قدرے مشترک ہے جس کی خاطر ان حضرات نے اپنے ذہن و فکر کا استعمال کیا یہاں اسی کے تناظر میں کچھ باتیں کہی جا رہی ہیں۔

جذبہ حریت کو مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس روح کی تقویت کے لیے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کا پرچم بلند کیا جس میں کسی حد تک کامیابی اور کسی حد تک ناکامی رہی، امام احمد رضا کا بھی نظریہ اتحادی تھا۔ وہ انتشار و اختلافات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے مگر ان کا یہ "نعرۂ اتحاد" مولانا آزاد کے "نعرۂ اتحاد" سے قطعی مختلف تھا۔ امام

احمد رضا انگریز اور ہندو دونوں قوموں سے قطع تعلق چاہتے تھے جبکہ مولانا آزاد انگریزوں سے نفرت اور ہندوؤں سے محبت کے حامی تھے درج ذیل سطور میں اسی طرز فکر کا دلائل و براہین کی روشنی میں تقابلی جائزہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت عبقری تھی تدبر، تفکر، دوراندیشی اور بہت ساری خوبیوں میں وہ اپنی مثال آپ تھے وہ صرف سیاسی ہی نہیں تھے بلکہ ان کی ذات میں کئی شخصیتیں جمع تھیں۔ بقول مولانا امین احسن اصلاحی۔

"وہ (ابوالکلام آزاد) کئی نہیں بلکہ کئی سو دماغوں کا نچوڑ تھے"۔ ۳

اگر ہندوستان کی خمیر میں تعصب نہ ہوتا تو مولانا ابوالکلام آزاد ان صلاحیتوں کے سبب سیاست کے نقطۂ عروج پر ہی پہنچکر دم لیتے، مگر ہندوستان کے ارباب بصیرت نے جو کھیل ان کے ساتھ کھیلا وہ سیاست دانوں پر مخفی نہیں، مولانا آزاد کے سیاسی شعور و آگہی پر گفتگو تو بعد میں کریں گے پہلے اس خاندان کا اجمالی ذکر ضروری ہے جس میں مولانا آزاد کی نشو ونما اور ذہن و فکر کی آرائش ہوئی۔

مولانا خیر الدین کی ولادت ۱۸۳۱ء دہلی میں ہوئی مولانا منور الدین (جوان کے رشتہ کے نانا ہوتے تھے) کی زیر نگرانی تربیت ہوئی انہوں نے اس طرح مولانا خیر الدین کی تربیت کی کہ کم عمری ہی میں منقولات و معقولات میں بالغ نظری حاصل کر کے اس دور کے جید علماء میں شمار کیے جانے لگے۔

مولانا منور الدین اور مولانا خیر الدین دونوں مذہبًا تصلب تھے۔ تقوی، و دیانتداری میں اپنی مثال آپ تھے۔ دونوں نے مذاہب باطلہ کی تردید میں ردّ و مناظرے کیے اور کتابیں لکھیں۔ مولانا منور الدین نے شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان کی رد میں کتابیں لکھیں مرد جامع مسجد پر امتناع نظیر خاتم النبیین کے موضوع پر زبردست مناظرہ کیا۔

مولانا خیر الدین جس زمانے میں سرزمین عرب پر مقیم تھے وہاں شیخ احمد دحلان کی انہیں رفاقت حاصل رہی ان دونوں نے مل کر جو وہابیت کی بیخ کنی کی وہ اہل علم پر مخفی نہیں مولانا خیر الدین نے دس جلدوں پر مشتمل ردّ وہابیہ کے موضوع پر کتاب لکھی جس نے دنیائے وہابیت

میں تہلکہ مچا دیا اور بقول مولانا آزاد

"شیخ احمد دحلان کی تصنیف "الرد علی الوھابیین" فی الحقیقت والد مرحوم کے خیالات کا عکس ہے"۔ ۴

مولانا خیر الدین کے مذہبی تصلب کا عالم یہ تھا کہ وہ امام احمد رضا جس کی پوری زندگی ردِ وہابیت کے لیے وقف تھی صحیح الاعتقاد تو ضرور تسلیم کرتے تھے مگر تصلب میں اپنے سے کم تر گردانتے تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں۔

"مولوی احمد رضا خان مرحوم سے ملنے کے بعد والد صاحب افسوس و حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے "دنیا بھر میں بس ڈھائی مسلمان رہ گئے ہیں ایک خود میں دوسرے مولانا عبد القادر بدایونی اور آدھے احمد رضا خان بریلوی"۔ ۵

ایسے متصلب فی الدین شخص کے گھر ہجرت کے دوران مکہ کی سرزمین پر ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء محلہ قدوہ متصل باب السلام میں مولانا آزاد کی ولادت ہوئی اصل نام "احمد" قرار پایا "محی الدین" لقب تھا "ابو الکلام آزاد" سے شہرت حاصل ہوئی جبکہ والد گرامی "فیروز بخت" کہہ کر پکارتے تھے اور مصرعۂ ذیل سے آزاد کی سنہ ولادت کا استخراج کیا تھا۔

جواں بخت جواں طالع جواں باد۔ (۱۳۰۵ھ)

دین حق کی ترویج وارتقاء اس خانوادہ کا محبوب مشغلہ تھا وہابیوں کے شدید مخالف تھے ایسے ماحول میں آزاد کی نشو و نما ہوئی اور ہر طرح اس ماحول میں وہ رنگ گئے اور وہابیوں سے متعلق وہ تمام اصطلاحات جو اس خانوادے میں رائج تھے ان کی زبان زد ہو گئے بقول مولانا آزاد۔

"دنیا کی ہر مکروہ و خبیث چیز اس لقب سے پکاری جاتی تھی۔ مثلاً حافظ جی کہتے تھے شب کو اس قدر وہابی تھے کہ نیند نہ آئی یعنی مچھر بہت تھے دیوان خانے میں کتابوں کے نیچے صندوق پڑے تھے ان کے نیچے وہابی چلے جاتے تھے اور پیندے میں سوراخ کر دیتے تھے یعنی چوہے، چنانچہ بڑی جد و جہد کے ساتھ وہابیوں کو پکڑا جاتا تھا اور ہم لوگ یوں حساب کرتے کہ آج ۲ دو وہابی مارے گئے ایک بہت بڑا وہابی

بھاگ گیا۔ ؎۶

مولانا ابوالکلام آزاد کو وہابیوں سے نفرت و عداوت ورثہ میں ملی تھی خاندانی ماحول میں اچھی طرح رچ بس گئے تھے مگر بعد میں خاندانی رسم و رواج اور آباء و اجداد کے مسلک سے انحراف کر لیا غیر مقلدیت کی طرف رجحان ہوگیا تھا بچپن کے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں میرا تخیل یہ تھا کہ وہابی کو خاص طرح کا ایک بڑا ہی مکروہ اور قابلِ نفرت مخلوق ہے۔ ؎۷

اس علمی اور مذہبی گھرانے میں آزاد کی تربیت ہوئی اس تربیت کا ثمرہ یہ ہوا کہ علم و ادب کے میدان میں اپنی عبقریت تسلیم تو کرائی ہی، افق سیاست پر بھی میر اعظم بن کر چمکے جس کی کرنیں آج بھی ہندوستانی بساطِ سیاست پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی باضابطہ سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۲ء میں "الہلال" کے اجراء سے ہی سمجھنا چاہئے۔ الہلال کے وجود میں آتے ہی غلامی کی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آزادی کی کرن پھوٹتی ہوئی نظر آنے لگی اس جریدہ کے ذریعہ آزاد اپنی آواز لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستانی سیاست پر چھا گئے اس پرچہ کے ذریعہ حصولِ آزادی کے لیے جو انہوں نے جدوجہد کی وہ ہندوستانی سیاست کا ایک اہم حصّہ بن چکا ہے البلاغ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ آزادی کے لیے مولانا آزاد سب کچھ قربان کردینا ارزاں سمجھتے تھے ہفت روزہ الجمعیت دہلی میں ہے۔

" مولانا کے نزدیک آزادی جزء ایمان تھی اس لیے مذہب اور سیاست میں کوئی بیر نہیں تھا لیکن وہ سیاست کو مذہبی فرقہ واری کے ماتحت نہ رکھنا چاہتے تھے ان کے ذہن میں سیاست کی جدید ترین شکلیں بھی تھیں اور قدیم قدریں بھی انہوں نے دونوں کا خوبصورت امتیاز کیا تھا تاکہ یہ صورت نہ ہو کہ

جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں
مارچ میں بلبل ہوں جولائی میں پروانہ ہوں ؎۸

مولانا آزاد کے ذہن و دماغ میں آزادی کا تصور رچا بسا تھا۔ اوائل عمر سے ہی آزادی کی جنگ میں کود پڑے تھے اس آزادی کا تعلق اسلام سے اس طرح پیدا کرتے کہ الہلال کا اداریہ پڑھنے والا شخص ان کے نظریات و خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے لکھا تھا کہ

"ایک چراغ جو روشن ہو کر پھر نہیں بجھتا وہ حریت صحیحہ کا چراغ ہے مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان کی آزادی ان کا دینی فرض ہے جس کی بجا آوری لازم ہے۔" ۹ے

مولانا آزاد اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیاب تھے درج ذیل سطور میں اسی کا انکشاف ہے بہرحال معاملہ کچھ بھی رہا ہو اس وقت کا ہندوستان جس طرح سیاسی کشمکش سے دوچار رہا ایسے پُر آشوب ماحول میں "الہلال" پیغمبر امن و شانتی اور رہبر راہ صداقت بن کر وجود پذیر ہوا، اور چونکہ اس پر مذہبی خول تھا اس لیے مذہب کے پرستاروں کے دلوں میں جلد ہی نفوذ کر گیا مگر مولانا آزاد چونکہ سیاسی تھے اس لیے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے سبب پابندی کے ساتھ اس کی اشاعت نہیں کر سکے لیکن جتنے شمارے چھپے مولانا آزاد نے تقریباً سب میں یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔

"الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالٹیکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا بھروسہ کیجیے اور نہ ہندوؤں کے ساتھ حلقۂ درس میں شریک ہو جائیے صرف اسی راہ پر چلئے جو اسلام کی بتائی ہوئی صراط المستقیم ہے۔" ۱۰ے

"الہلال" کے بند ہونے کے بعد "البلاغ" کا اجراء ہوا دونوں کی اشاعت کا ایک ہی مقصد تھا۔ جب اس کے اداریوں میں مولانا آزاد نے آزادی کا تصور پیش کیا تو اس سے انگریز حکومت کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے فوراً مولانا کو بنگال چھوڑنے کا حکم صادر کیا دوسرے صوبوں دہلی پنجاب اور بمبئی جانے پر بھی پابندی عائد کر دی لہٰذا مولانا رانچی چلے گئے جہاں وہ ۳۱؍ دسمبر ۱۹۱۹ء تک رہے۔ جون ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اور ان کی تحریک "عدم تعاون" میں شریک ہو گئے انہیں گاندھی کی اس رفاقت اور تحریک میں شرکت پر فخر تھا، تحریک کے ہراول دستہ میں شریک ہو کر مفید مشورے دینے لگے، ایک موقعہ پر ارکانِ تحریک کو مشورہ سے نوازتے ہوئے

فرماتے ہیں۔

"میں نے آزادی اور انصاف کے حصول کے لیے عدم تعاون اور عدم تشدّد کے ذریعہ جدوجہد کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے لیکن ہماری اس جدوجہد کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلح فوجیں تعینات ہیں جن کے پاس قتل وخونریزی کے تمام ہتھیار موجود ہیں اس لیے گاندھی جی کے برخلاف میرا یہ خیال نہیں ہے کہ مسلح طاقتوں کا ان ہی جیسی طاقت سے مقابلہ کرنا غلطی ہے۔" [11]

گاندھی جی کی ملاقات سے مولانا آزاد کی سیاسی زندگی میں چار چاند لگ گئے کانگریسی پارٹی کے بنیادی عناصر میں ان کا شمار ہونے لگا کانگریس کی ہر پالیسی اور ہر اسکیم مولانا آزاد کے مشورہ کے بغیر نامکمل تصور کی جاتی انڈین نیشنل کانگریس ہو یا تحریک خلافت مسئلہ حصول آزادی ہو یا تحریک ترک موالات ہر جگہ ان کی حیثیت روح کی طرح تھی گاندھی جی کے افکار ونظریات سے کسی زمانے میں اختلاف رہا ہو تو رہا ہو مگر بعد میں ان سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ گاندھی جی کے افکار وخیالات ان کے ضابطۂ زندگی بن گئے، جب گاندھی جی نے ہر طرح انہیں اپنا بنا لیا تو ہندو قوم کو خوش کرنے کے لیے ناموسِ دین مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال کیے بغیر وہ سب کچھ کر بیٹھے جس میں ہندوؤں کی رضا ہوتی تھی یہاں تک کہ انہوں نے ناگپور کانگریس کے موقع پر جمعہ کی امامت صغریٰ میں مسٹر گاندھی کی توصیف وتعریف خطبہ اولیٰ کے حصہ اوّل میں نہایت بلند آہنگی سے کی اور ارشاد فرمایا۔

"مہاتما گاندھی کی مقدس ذات اور پاکیزہ خیالات" [12]

اس طرح کے فاسد خیالات صرف مولانا آزاد کے ہی نہیں تھے بلکہ ان تمام لوگوں کا یہی حال تھا جو ہندو مذہب پلیٹ فارم سے اٹھنے والی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے مولانا اشرف علی تھانوی ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سب سے عجیب بات یہ دیکھی گئی کہ جو حضرات خلافت اسلامیہ کی حفاظت کی جدوجہد کر رہے تھے وہ ہندوؤں کی ہمنوائی کو احیاء خلافت اسلامیہ کیلئے ممد ومعاون

سمجھ رہے تھے اور جوشِ جذبات میں اسلامی شعائر کو چھوڑ کر کفر اپنا رہے تھے
چنانچہ اس زمانے میں مسلمانوں نے اپنی پیشانی پر قشقہ بھی لگوایا ہندو لیڈروں
کی ارتھیوں کو کندھا بھی دیا ہندو لیڈروں کو مساجد میں ممبر رسول پر بٹھایا قرآن
پاک کو مندروں میں لے جایا گیا۔" ۱۳ء

اس دور کے اکثر مسلم قائدین کا یہی رویہ تھا خلافت اسلامیہ کی حفاظت تو محض دکھاوا
تھی ان سب کا مقصد انگریزوں کو مجبور کر کے ہندوستان پر خود مختار حکومت کا حصول تھا۔
۱۹۱۷ء میں جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے جس کا وعدہ کیا تھا ابو الکلام آزاد کے درج
ذیل خیالات سے اس کی نشاندھی کی جا سکتی ہے۔

"کوشش اور لڑائی صرف اماکنِ مقدسہ اور خلافت کے لیے نہیں بلکہ ہندوستان
کو خود اختیاری حکومت دلانے کے لیے ہے اگر خلافت کا خاطر خواہ فیصلہ ہو بھی
جائے تاہم ہماری جدوجہد جاری رہے گی اس وقت تک کہ ہم گنگا و جمنا کی
مقدس سرزمین آزاد نہ کرالیں۔" ۱۴ء

امام احمد رضا کی علمی، عملی اور عبقری شخصیت حلقۂ علم وادب میں محتاج تعارف نہیں
مذہب میں کتنے متصلب تھے ان سے ملنے والا اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص
جانتا ہے آپکی زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بجائے صرف اتنا کہنا کافی ہے۔

"جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود"

معاصر علماء اور دانشوروں پر نکتہ چینی اور علمی گرفت کرنے کے علاوہ ماضی کے اساطین
علم وادب کی لغزشوں کو بھی نہیں بخشا ہے باطل کی تردید میں ان کا قلم تیغ براں کی طرح چلتا
تھا ان کی چھوٹی بڑی ایک ہزار تصانیف جس کے بہترین شواہد ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد کے وہ
نظریات جو شریعت سے متصادم تھے اس کی انہوں نے تردید کی اور واضح لفظوں میں لکھا کہ آزاد کا یہ
نظریہ اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے فرماتے ہیں۔

"ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی آڑ ہے اصل مقصود بغلامی ہنود سوراج کی

چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کر دی ہے بھاری بھر کم خلافت کا نام لو عوام بپھریں چندہ خوب ملے اور گنگا و جمنا کی زمینیں آزاد کرانے کا کام چلے۔

اے پس رو مشرکاں بہ زم زم نہ رسی

کیں رہ کہ تو می روی بہ گنگ و جمن است" ۱۵

کہتے ہیں کہ سچی بات کڑوی ہوتی ہے امام احمد رضا نے جب مولانا آزاد کی گندہ پالیسیوں کا انکشاف کیا اور مذہب کی آڑ میں امت مسلمہ کو قعرِ مذلت میں ڈالنے والی سیاست کی نقاب کشائی کی تو ہمدردان قوم و ملت نے اسے قوم کی ہمدردی پر محمول کیا اور گاندھوی سیاست کے دریوزہ گر مسلم قائدین نے اسے سیاست کا رخ دیگر مخالفت کے درپے آزار ہوگئے۔ ۱۳۳۹ھ میں بریلی جمعیۃ کانفرنس کے موقع پر مولانا آزاد نے امام احمد رضا کی جناب میں ایک عریضہ ارسال کیا جو ڈپلومیسی سے خالی نہیں تھا اس میں وہ لکھتے ہیں۔

"مسئلہ تحفظ و صیانت خلافت اسلامیہ ترک موالات اور اعانت اعدائے محاربین اسلام وغیرہ مسائل حاضرہ کی نسبت جناب کے اختلافات مشہور ہیں"۔ ۱۶

درج بالا عبارت کی روشنی میں ماہرِ رضویات پروفیسر مسعود احمد لکھتے ہیں۔

"جس کو تاریخ کا علم نہیں وہ ان کلمات سے گمراہ ہو سکتا ہے مگر باخبر لوگ جانتے ہیں کہ امام احمد رضا کو نہ سلطنت ترکیہ کی مدد و اعانت سے انکار تھا بلکہ ان کی جماعت رضائے مصطفےٰ نے خود اس کے لیے کوشش کی"۔ ۱۷

امام احمد رضا اگر مولانا آزاد کے سیاسی موقف کی تائید نہیں کر رہے تھے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ انگریزوں کے ہمنوا تھے بلکہ وہ تمام اسلام دشمن طاقتوں کے مخالف تھے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف ان کا جذبۂ عداوت و نفرت یکساں تھا، چنانچہ جس زمانے میں ترکوں کے مقابلے میں برٹش گورنمنٹ کی حمایت اور ان کے بالمقابل مسلمان فوجیوں کو بھیجنے کی بات ہوئی تو ترک موالات کے حامی علماء جنہوں نے انگریزوں کی حمایت میں تُرک مسلمانوں کے بالمقابل مسلمان فوج روانہ کرنے کا فریضہ انجام دیا تھا اس وقت بھی امام احمد رضا نے اس عمل

کی کھل کر مخالفت کی تھی، مولانا معین الدین اجمیری باوجود امام احمد رضا کی مخالفت کے یہ اعتراف کرتے ہیں۔

"ترک موالات کی تجویز ۵ ایسی ہے جس کو دونوں بزرگوں مولوی اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد رضا نے تسلیم کیا ہے اور وہ یہ کہ گورنمنٹ برطانیہ کو فوجی امداد نہ دی جائے۔" ۱۸

اس طرح کے بے شمار شواہد ہیں جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام احمد رضا کو صرف انگریزوں سے نہیں بلکہ ان کے لباس، طرز رہائش، تہذیب و تمدن، تعلیم و تربیت ہر چیز سے نفرت تھی اس سلسلہ میں "گناہ بے گناہی مؤلفہ پروفیسر مسعود احمد کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔

اسلام میں جس سیاست کا تصور ہے امام احمد رضا اس کے علمبردار تھے اور وہ اسلامی سیاست جماعتی مصالح کے لیے اور امت مسلمہ کی جان و مال کی حفاظت کے لیے ہے عزت و آبرو کو داؤ پر لگا دینے والی سیاست سے اسلام روکتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں کتنے سیاسی نشیب و فراز آئے اور انہوں نے اس موقع پر کونسی چالیں چلیں وہ ان کے سیاسی معاصرین کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ان کے بعض ہمنواؤں نے ان کے اس طرز عمل کو قائدانہ کردار سے تشبیہ دیا ہے اور خود مولانا آزاد کو بھی بزعم خویش کامل یقین تھا کہ امت مسلمہ کی قیادت کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں، اسی حوصلۂ قیادت اور جذبۂ اجتہاد نے انہیں اپنے آباء و اجداد کے مسلک کی مخالفت اور اس سے انحراف پر آمادہ کیا امام احمد رضا نے مولانا آزاد کے اس جذبۂ قیادت کا جو پردہ چاک کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے لکھتے ہیں۔

"مسٹر آزاد اگرچہ اپنے نشے میں تمام مجتہدین کرام سے اپنے کو اعلیٰ جانتے ہیں ان کے ارشادات کو ظنی اور اپنے توہمات کو وحی سے مکتسب قطعی مانتے ہیں اور سلطان کا نام محض دکھاوا ہے، تمام امت سے اپنی امامت مطلقہ منوانے کا دعویٰ ہے دیکھو رسالہ خلافت کا اخیر مضمون اھد کم سبیل الرشاد (میرے پیرو ہو

جاؤ میں تمہیں راہ حق کی ہدایت کروں گا۔ [۱۹]

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہی جذبۂ قیادت تحریک ترک موالات میں بھی کارفرما رہا ترک موالات (نان کوآپریشن) کی اسکیم میرٹھ کے اجلاس میں اگرچہ گاندھی نے پیش کی مگر مولانا آزاد نے اس میں اس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ وہ خود اس تحریک کے ہیرو بن گئے یہ تحریک شباب پر تھی اور مولانا احمد رضا زندگی کی آخری بہاریں گن رہے تھے مگر اس موت و زندگی کی کشمکش کے عالم میں بھی انہوں نے آزاد اور ان کے دوسرے ہم نواؤں کو معاف نہیں کیا اور تحفظ شریعت مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے عالمانہ کردار ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں ہندو مسلم اتحاد کی کتنی اہمیت تھی اس کا اندازہ ان کی اس تقریر کے اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے ۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء میں انڈین نیشنل کانگریس دلی کے خصوصی اجلاس میں کی تھی۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہو گا لیکن ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔" [۲۰]

اور اسی پر بس نہیں بلکہ انہوں نے علی گڈھ کالج کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا۔

"حکومت سے ترک موالات اس طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکان اسلام فرض ہیں۔ [۲۱]

مولانا ابوالکلام آزاد ترک موالات کی فرضیت کو ارکانِ اسلام کی طرح نصِ قطعی سے ثابت کرتے چونکہ وہ اپنے کو مجتہد اور امت مسلمہ کا قائد سمجھتے اس لیے کسی کی حرف گیری پر دھیان نہ دیتے ہندو مسلم اتحاد اور ترک موالات سے متعلق مولانا آزاد کے قائدانہ کردار نے کتنے گل کھلائے اور کہاں کہاں انہیں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کی ایک طویل داستان ہے۔ تفصیلات میں نہ جاتے

ہوئے یہاں مسلم کالج علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور سے متعلق ذکر ضروری سمجھوں گا۔ جسے نیست و نابود کرنے کا مولانا آزاد نے ایک مستحکم منصوبہ بنالیا تھا۔ گاندھی جی کے ایما، پر اس کالج کو تہس نہس کرنے کے لیے آزاد کے ساتھ مولانا محمود حسن بھی تھے ان حضرات نے مقصد میں کامیابی کے لیے ہزار ہا کوششیں کر ڈالیں مگر کوئی کوشش بار آور نہ ہوئی علمائے دیوبند نے اس کالج کی مخالفت کو عینِ اسلام اس لیے قرار دیا تھا کہ اس میں عصر حاضر کی تعلیم کا بندوبست ہے۔ جبکہ بعض حضرات کھلے طور پر اس کی حمایت میں تھے الغرض مولانا محمود حسن کے فتاوے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی تقریریں آخر میں رنگ لائیں ہوا یہ کہ ڈاکٹر انصاری اور محمد علی جوہر کی زیر سر کردگی مجاہدینِ اسلام کی ایک عظیم فوج نے علی گڑھ کالج پر حملہ بول دیا وہ تو کہئے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، مولانا سید اشرف اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے اپنی بلند ہمتی اور عظیم مساعی کا مظاہرہ کیا اگر وہ لوگ ایسا نہ کرتے تو کالج کے شکست و ریخت کا جو منظر سامنے ہوتا وہ ملت کے لیے ایک زبردست المیہ ہوتا۔ ۲۲

جب مولانا آزاد کا حملہ علی گڑھ کالج پر ناکام ہو گیا تو پھر اسلامیہ کالج لاہور پر حملہ بولنے کی مہم ہوئی ابوالکلام آزاد ۲۰ ؍ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو لاہور پہنچے وہاں انہوں نے کالج کے اراکین کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کچھ تو ان کے دام تزویر میں پھنس گئے اور کچھ نے ان کے نظریات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مولانا آزاد کا کہنا تھا کہ ترک موالات کے لیے ضروری ہے کہ سرکار برطانیہ سے جو امداد ملتی ہے بند کی جائے اور یونیورسٹی سے کالج کا الحاق بھی ختم کیا جائے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان دونوں صورتوں میں موالات کا ارتکاب ہوتا ہے۔ ۲۳

مولانا آزاد نے جب کالج کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا تو انجمن حمایت اسلام کے سکریٹری نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ علماء جو مسٹر گاندھی کے حلقہ اثر سے باہر ہوں اور اعلائے کلمۂ حق جن کی زندگی کا وظیفہ ہو ان سے رجوع کیا جائے اور اس کا صحیح جواب منگایا جائے سکریٹری نے اس کام کی ذمہ داری پروفیسر حاکم علی کے سپرد کی جنہوں نے ترک موالات کی شرعی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے ایک فتویٰ ترتیب دیا پھر اس کی تصدیق و تصحیح کے لیے درج ذیل خط کے ساتھ امام احمد رضا کے

پاس بریلی ارسال کر دیا۔

" آقائے نامدار، موید ملت طاہرہ، مولانا و بالفضل اولانا شاہ احمد رضا خان

صاحب دام ظلہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

پشت ہذا پر کا فتویٰ مطالعہ گرامی کے لیے ارسال کر کے التجا کرتا ہوں

کہ دوسری نقل کی پشت پر اس کی تصحیح فرما کر احقر نیاز مند کے نام بواپسی ڈاک

اگر ممکن ہو سکے تو آج ہی یا کم از کم دوسرے روز بھیج دیں، انجمن حمایت اسلام کی

جنرل کونسل کا اجلاس بروز اتوار ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ہونا قرار پایا ہے اس میں

یہ پیش کرنا ہے دیوبندیوں اور نیچریوں نے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں کوئی تامل

نہیں کیا، ہندوؤں اور گاندھی کے ساتھ موالات قائم کر لی ہے اور مسلمانوں

کے کام میں روڑا اٹکانے کی ٹھان لی ہے اور عالم خفیہ کو ان کے ہاتھوں سے بچائیں

اور عند اللہ ماجور ہوں۔

نیاز مند دعاگو حاکم علی بی اے موتی بازار لاہور۔

۲۵ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء ۔ ۲۴

امام احمد رضا نے اس فتویٰ کی تصدیق فرماتے ہوئے لکھا۔

" الحاق واخذ امداد اگر نہ کسی امر خلاف اسلام و مخالف شریعت سے مشروط

نہ اس کی طرف منجر تو اس کے جواز میں کلام نہیں ورنہ ضرور ناجائز و حرام ہوگا مگر

یہ عدم جواز اس شرط یا لازم کے سبب سے ہوگا نہ بر بنائے تحریم مطلق معاملت جس

کے لیے شرع میں اصلاً اصول نہیں " ۲۵

فتویٰ مبسوط ہے قرآن واحادیث کے دلائل سے مزین ہے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی علمیت پر

اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" امداد تعلیم کا روپیہ کیا انگلستان سے آتا ہے وہ بھی یہیں کا ہے تو حاصل دہی

ٹھہرا کہ مقاطعت میں اپنے مال سے نفع پہنچانا مشروع اور خود نفع اپنا لینا ممنوع

اس الٹی عقل کا کیا علاج مگر اس قوم سے کیا شکایت جس نے نہ صرف اسلام بلکہ

نفسِ اسلام کو پلٹ دیا مشرکین سے وداد و اتحاد بلکہ غلامی و انقیاد فرض کیا

خوشنودی ہنود کے لیے شعائر اسلام بند اور شعائر کفر کا ہاتھوں پر علم بلند

مشرکین کی جے پکارنا ان کی حمد کے نعرے مارنا انھیں اپنی اس حاجت دینی میں

جسے نہ صرف فرض بلکہ مدار ایمان ٹھہراتے ہیں یہاں تک کہ اس میں شریک نہ ہونے

والوں پر حکم کفر لگاتے ہیں۔" ۲۶

امام احمد رضا کی اس تصدیق کو مفتی اعظم ہند مولانا مصطفےٰ رضا نے درج ذیل مکتوب

گرامی کے ہمراہ پروفیسر مولوی حاکم علی کی جناب میں ارسال کیا۔

"مکرم کرم فرما مولوی حاکم علی صاحب بی اے سلمہم

بعد اہدائے ہدیہ مسنونہ ملتمس کل گیارہ بجے آپ کا فتویٰ آیا اس وقت سے

شب کے بارہ بجے تک اہم ضروریات کے سبب ایک حرف لکھنے کی فرصت نہ

ہوئی آج صبح بعد وظائف یہ جواب ارقام فرمایا امید ہے کہ فتاویٰ کی نقل کے بعد

آج ہی کی ڈاک سے مرسل ہو اور مولیٰ تعالیٰ قادر ہے کہ کل ہی آپ کو پہنچ جائے

ماموں کے وقت پر وصول سے مطلع فرمائیں۔

والسلام

فقیر مصطفےٰ رضا قادری نوری عفی عنہ

۱۵ صفر المظفر ۱۳۳۹ھ ۲۷

موالات سے متعلق دیگر تفصیلات تو کتاب "المحجۃ الموتمنہ فی آیۃ الممتحنہ"

میں دیکھی جا سکتی ہے لیکن اس بحث کا لب لباب درج ذیل ہے

موالات مطلقاً ہر کافر ہر مشرک سے حرام ہے اگرچہ ذمی مطیع اسلام ہو اگرچہ اپنا باپ

یا بیٹا یا بھائی یا قریب ہو۔ قال تعالیٰ لا تجد قوماً یؤمنون باللہ والیوم

الاٰخر یوادون من حاد اللّٰہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم او

ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم" ۲۸

"تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان

سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اگرچہ وہ انکے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں"

موالات دو قسم ہے۔

اوّل حقیقیہ : جس کا ادنیٰ رکون یعنی میلان قلب ہے پھر وداد پھر اتحاد پھر اپنی خواہش

سے بے خوف و طمع انقیاد پھر تبتل یہ بجمیع وجوہ ہر کافر سے مطلقاً ہر حال میں حرام ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ ۲۹

"ظالموں کی طرف میل نہ کرو کہ تمہیں آگ چھوئے مگر میل طبعی جیسے ماں باپ اولاد، زن

حسینہ کی طرف کہ جس قدر بے اختیار ہو زیر حکم نہیں پھر بھی اس تصور سے کہ یہ اللہ و رسول کے دشمن

ہیں ان سے دوستی حرام ہے"

دوم صوریہ : کہ دل اس کی طرف مائل نہ ہو مگر برتاؤ وہ کرے جو بظاہر محبت و میلان کا

پتا دیتا ہو یہ بحالت ضرورت و مجبوری صرف بقدر ضرورت و مجبوری مطلقاً جائز ہے قال تعالیٰ

الا ان تتقوا منھم تقٰۃ۔ ۳۰ ــــ بقدر ضرورت یہ کہ مثلاً صرف عدم اظہار عداوت

میں کام نکلتا ہو تو اسی قدر پر اکتفا کرے اور اظہار محبت کی ضرورت ہو تو پہلو دار بات کہے

صریح کی اجازت نہیں اور بے اس کے نجات نہ ملے اور قلب ایمان پر مطمئن ہو تو اس کی

رخصت اور اب بھی ترک عزیمت۔

صوریہ کی اعلیٰ قسم مداہنت ہے اس کی رخصت صرف بحالت مجبوری و اکراہ ہی ہے اور

ادنیٰ قسم مدارات یہ بھی بمصلحت جائز۔ ۳۱

یہ ہے اس بحث کا اختصار جسے امام احمد رضا نے قرآن و احادیث اور اقوال صحابہ و آئمہ

کی روشنی میں سو صفحات پر مشتمل المحجۃ الموتمنہ فی آیۃ الممتحنۃ نامی رسالے میں بیان

کیا ہے۔ ان کی اس تحریک کی مخالفت کا مقصد اہلِ ہنود کے عزائم کا قلع قمع تھا کیونکہ بقول ڈاکٹر

مطلوب حسین قریشی۔

"ترک موالات کا مقصد بظاہر حکومت برطانیہ سے عدم اعتماد کا اظہار و عدم تعاون تھا لیکن در پردہ ایسے حالات پیدا کرنا جن کی وجہ سے مسلمان تمام چیزوں سے محروم ہو جائیں اور ہر جگہ ہر محکمہ میں صرف اہلِ ہنود باقی رہ جائیں" ۳۲

جو لوگ ترک موالات کے حامی جس میں پیش پیش مولانا ابوالکلام آزاد تھے وہ آیۃ کریمہ "قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ" ۳۳ میں کافۃ سے مراد دو فقرے لیتے تھے۔

اول یہ کہ ہنود میں مقاتل فی الدین صرف وہی ہیں جنہوں نے وہ مظالم کیے تو مقاتل نہیں مگر مقاتل بالفعل جس نے ہتھیار اُٹھایا اور قتال کو آیا تاکہ عامہ ہنود کو قاتلوکم فی الدین سے بچالیں۔

دوم یہ کہ جو مقاتل بالفعل نہیں اس سے اظہار عداوت فرض نہیں تاکہ بزور زبان ان سے وداد و اتحاد کی راہ نکالیں۔ اب آیۃ کریمہ میں چار احتمال ہیں۔

اول: دونوں کافۃ مسلمانوں سے حال ہوں یعنی تم سب مسلمان مشرکوں سے لڑو جس طرح وہ تم سب سے لڑتے۔

دوم: دونوں مشرکین سے حال ہوں یعنی سب مشرکین سے لڑو جس طرح وہ سب تم سے لڑتے ہیں۔

سوم: پہلا کافۃ مشرکین سے حال ہو اور دوسرا مومنین سے یعنی تم بھی سب مشرکین سے لڑو جس طرح وہ تم سب سے لڑتے ہیں یہ قول عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے۔

چہارم: اس کا عکس یعنی سب مسلمان مشرکوں سے لڑیں جس طرح سب مشرک مسلمانوں سے لڑتے ہیں کبیر میں اسی کو ترجیح دی اور لباب میں اسی پر اقتصار کیا۔" ۳۴

تحریک ترک موالات کے علمبردار علماء کے نظریات قرآن و احادیث کے علاوہ اقوال صحابہ و ائمہ سے بھی متصادم تھے اس لیے امام احمد رضا کے علاوہ ان کے خلفاء و تلامذہ نے اس نظریہ کی تردید اور اس کی بیخ کنی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو داؤ پر لگا دیا جس میں انہیں کافی حد

تک کامیابی بھی ملی۔

مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جو امام احمد رضا کے ارشد خلفاء میں شمار ہوتے تھے انہوں نے جس بے باکانہ انداز میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے حوارین کے باطل نظریات کا قلع قمع کیا اس سے ان کی علمی عبقریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، شروع میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا تادم زیست اسی پر اٹل رہے اور مرور ایام کے ساتھ ساتھ ان کی صداقت شعاری آشکار ہوتی گئی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں۔

"مرحوم (مولانا سید سلیمان اشرف) نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ برقائم ہے سارے علماء سیلاب کی زد میں آچکے تھے صرف مرحوم اپنی جگہ برقائم رہے۔" [۳۵]

خلافت اور ترک موالات دونوں سے متعلق انہوں نے طویل بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ہم اپنے مذہب میں ہندوؤں سے اتحاد نہیں کرسکتے ہیں۔ مقامات مقدسہ خلافت اسلامیہ کے مسائل سے اختلاف نہیں اختلاف ان حرکات سے ہے جو منافی دین ہیں۔

مولانا سید سلیمان اشرف نے پھر تجزیہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ کیا امور ہیں جو اس تحریک میں منافی دین ہیں اور ان پر شریعت کی طرف سے کیا حکم صادر ہونا چاہیئے "تمام ابحاث کا خلاصہ یہ ہوا" کے بعد لکھتے ہیں۔

(۱) کافر سے ساتھ دلی دوستی اور قلبی محبت کفر ہے۔

(۲) دل میں کافر کی دوستی نہیں لیکن عمل دوستوں کے مانند مثل یہ حرام ہے۔

(۳) قلب محبت کفر و کفار سے پاک بلکہ بیزار لیکن کافر کے مذہبی اعمال میں عملاً شرکت کی جائے یہ حرام ہے۔

(۴) کافر کے دین کی حمایت حرام ہے۔

(۵) کافر کی ایسی مدد کرنا جس سے دین اسلام کا یا مسلمانوں کا نقصان ہوتا ہو حرام ہے۔

(۶) کافر سے ایسی مدد لینا جس میں اپنے دین یا اپنے دینی بھائیوں کا نقصان ہوتا ہو حرام ہے
(۷) مدارات فعل جمیل عمل معروف بر و احسان اور عدل و انصاف ہر حال میں جائز ہیں بلکہ بعض کفار کے ساتھ احسن و انسب۔
(۸) دنیاوی کاروبار اور لین دین ہر کافر حربی اور غیر حربی سے جائز کسی وقت بھی حرام نہیں
(۹) ان احکام میں کفار ہند اور کفار یورپ سب مساوی ہیں بجز اس کے کہ کفار اہل کتاب کا کھانا کھانا اور نکاح میں کتابیہ عورت کا لانا بموجب حکم قرآن پاک مباح و جائز ہے اس کے سوا جملہ احکام شرعیہ کفار اہل کتاب و کفار غیر اہل کتاب دونوں کے لیے یکساں ہیں۔" ۳۶

امام احمد رضا کی زندگی میں متعدد سیاسی مسائل ابھر کر سامنے آئے مگر وہ مسائل جو شریعت سے متصادم تھے انہوں نے اسے قطعاً برداشت نہیں کیا اور جس بھی طرح ممکن ہو سکا اس کی مخالفت کی جس کے سبب اپنے تو اپنے انصاف پسند معاندین بھی ان کی مدح میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔
مولانا کوثر نیازی سابق وزیر وفاقی حکومت پاکستان کا یہ تبصرہ یہاں برمحل ہوگا فرماتے ہیں۔

"تحریک ترک موالات، تحریک ہجرت، تحریک خلافت اور ایک اور بحث کہ ہندوستان دارالسلام ہے یا دارالحرب ان سارے موضوعات پر جو امام احمد رضا کا نقطۂ نظر تھا ہر چند کی اس پر گرد اڑائی جا رہی ہے لیکن علمی سیاست کو تقاضوں سے جس قدر ہم آہنگ اور دینی اقدار کی ترجمانی سے جس قدر نزدیک اور حقیقت پر مبنی ان کا موقف ہے کسی اور کا نہیں، تحریک ترک موالات میں جب قائدین کانگریس نے یہ صدا دی کہ انگریز کے ساتھ ہر قسم کا تعلق ختم تو انہوں نے کہا کہ صرف انگریز سے ہی کیوں ہندو سے کیوں نہیں ؟ ہر مشرک اور تمام کافر کے بارے میں ترک موالات کا وہی حکم ہے جو انگریز کے بارے میں ہے پھر ہندو کے ساتھ مل کر انگریز کے خلاف یہ تحریک چلانا گاندھی کی آندھی میں گرفتار ہونے کے مترادف تھا۔
اعلیحضرت (امام احمد رضا) نے جو اس سلسلہ میں سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے وہ

حقیقتاً مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے عین مطابق تھا"۔ ۳۷؎

تحریک ترک موالات کو من وعن تسلیم کرنے میں کتنی شرعی قباحتیں تھیں اور اس سلسلہ میں علمائے حق کا رجحان کیا تھا اس کی صراحت ڈاکٹر سید جمال الدین نے اس طرح کی ہے۔

"ان کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ شعائر دینی جیسے قربانی گاؤ کو ختم کیا جارہا ہے اصل مقصد خلافت کی حفاظت نہیں سوراج ہے اور چونکہ ملک کی اکثریت ہندوؤں کی ہے لہٰذا سوراج کا مطلب ہندوراج ہوگا۔ خلافت مذہبی تحریک ہے تو اس کی قیادت ایک مشرک کے سپرد کیوں کی گئی ہے مشرک کو منبر رسول پر کیوں بٹھایا گیا کیوں مسلم لیڈروں نے قشقہ لگوایا اور مشرک کی ٹکٹکی اٹھائی"۔ ۳۸؎

لیکن بعض علمائے حق جس میں بدایوں اور فرنگی محل، لکھنؤ کے علماء پیش پیش تھے ان تحریکوں کا ساتھ دیا اور ہر طرح گاندھوی سیاست کی تائید کی امام احمد رضا نے ایسے علماء کا بھی تعاقب کیا۔ جو سنّی علماء امام احمد رضا کے قلم کا نشانہ بنے ان میں مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالباری، مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی کے ہمنوا تھے ترک موالات میں ان کا وہی نظریہ تھا جس کے علمبردار گاندھی جی تھے ایک عرصہ تک انہوں نے اسی نظریہ کی اشاعت بھی کی جب امام احمد رضا کو اِن کے اس نظریہ کا علم ہوا تو انہوں نے مولانا عبدالباری کے پاس کئی خطوط ارسال کیے جس میں ترک موالات کو تسلیم کر لینے سے جو شرعی قباحتیں لازم آتی تھیں اس کی طرف اِشارہ تھا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ مولانا عبدالباری جو اسرار علوم قرآنی کے ماہر تھے مذہبیات پر گہری نظری تھی تحریک ترک موالات سے کیوں کر متاثر ہوئے اور کس طرح گاندھی اور مولانا آزاد کے ہم خیال ہو گئے کچھ کہا نہیں جا سکتا بہر حال امام احمد رضا کی ان سے مسلسل خط و کتابت کے بعد حق آشکار ہو گیا اور وہ گاندھی جی کی اس تحریک سے قطع تعلق کر کے امام احمد رضا کے افکار و نظریات کی تائید کرنے لگے۔ مولانا کوثر نیازی رقمطراز ہیں۔

" جب ہر طرح حق آشکار ہو گیا تو انہوں نے اعتراف جرم میں تساہلی نہیں برتی اور ترک موالات سے اپنی توبہ کا اعلان شائع کر دیا اس توبہ نامہ میں درج ذیل عبارت درج تھی۔

" مجھ سے بہت سے گناہ سرزد ہوئے ہیں کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ مجھے ان پر ندامت ہے زبانی تحریری اور عملی طور پر مجھ سے ایسے امور سرزد ہوئے جنہیں میں نے گناہ تصور نہیں کیا تھا لیکن مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی انہیں اسلام سے انحراف یا گمراہی یا قابل مواخذہ خیال کرتے ہیں ان میں سب سے میں رجوع کرتا ہوں جن کے لیے پیش روؤں کا کوئی فیصلہ یا نظیر موجود نہیں ان کے بارے میں میں مولانا احمد رضا خان کے فیصلوں اور فکر پر کامل اعتماد کا اظہار کرتا ہوں۔" ۳۹

علی برادران کے پیر و مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے ترک موالات کی حمایت پر مولانا احمد رضا نے جو مراسلات کی اس میں کچھ اشعار بھی تھے جس میں حالات حاضرہ کا بھرپور جائزہ ہے اور اس تحریک کے قائدین پر کڑی تنقید بھی، جن اشعار میں مولانا ابو الکلام آزاد کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے اس میں درج ذیل اشعار خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

دانی چہ کرد ابو الکلام آزاد — آزاد ز دین و شرع و اسلام و رشاد
بستودہ صفات و پاک ذاتش گفتہ — در خطبہ جمعہ حمد گاندھی بنہاد

دانی چہ شد ابو الکلامت معلم — گفتا من بہر ہندوم مستسلم
گر بر ہندو گزندے آید ز افغاں — بر ریک ہندو فدا کنم دہ مسلم

دانی کہ چہ گفت ابو الکلام رخ زرد — عیسیٰ نہ نبی بود و نہ شرعی آورد
برادر کشید ندو یہود ش کشتند — بنگر کہ بحرف حرف قرآں رد کرد۔ ۴۰

امام احمد رضا کے ان اشعار کا کوئی نہ کوئی پس منظر ہے کچھ اشعار تو اسی پس منظر میں ہیں جو انہوں نے ناگ پور خلافت کانفرنس میں گاندھی کی تعریف میں کی تھیں۔ اخبار "زمیندار" اور اخبار "تاج" جبلپور ص ۱۰۸ کی صراحت کے مطابق انہوں نے خلافت کانفرنس کے پنڈال میں جمعہ پڑھایا اور خطبے میں گاندھی جی کی صداقت و حقانیت پر قسمیں کھائیں اور الہ آباد کے ایک جلسۂ عام میں کرسی صدارت سے اعلان فرمایا کہ "مقامات مقدسہ کا فیصلہ اگرچہ ہمارے حسب دلخواہ بھی ہو جائے تب بھی اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک گنگا اور جمنا کی مقدس سرزمین کو آزاد نہ کرالیں گے۔" [۱۸]

ان اشعار کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا آسان ہو گیا ہو گا کہ مولانا ابو الکلام آزاد کے دل میں مسلمانوں کے لیے کس درجہ ہمدردی تھی ہمارے خیال سے اگر انہیں امت مسلمہ سے واقعی الفت و محبت ہوتی تو وہ ہرگز یہ نہ فرماتے۔

"اگر کسی ہندو کو افغان سے کوئی تکلیف پہنچی تو میں ایک ہندو کی خاطر دس مسلمانوں کا خون بہانا روا سمجھوں گا"

یہ تھے قوم کے سچے ہمدرد کی مخلصانہ سچی ہمدردی کی باتیں جنہیں ان کے متبعین آج "امام الہند" کہہ کر خراج تحسین و عقیدت پیش کرتے ہیں۔

مگر ان ابن الوقتوں کے برخلاف امام احمد رضا نے مولانا ابو الکلام آزاد کی سیاسی زندگی کو مدنظر رکھ کر حقائق و معارف کی روشنی میں جو نظریہ قائم کیا تھا وہ صد فی صد صحیح اور مبنی برحقیقت تھا۔

آزاد مگر نہ تو بے شک مشرک   دہ مسلم می دہی پئے یک مشرک

زاسلامت اگر بہرہ بدے میکردے   برناخن مسلمے فدا لک مشرک۔ [۴۲]

تحریک خلافت جس کے زیر سایہ تحریک ترک موالات کی نشو و نما ہوئی امام احمد رضا نے اس تحریک سے متعلق بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور جو لوگ اس تحریک میں پیش پیش تھے ان پر کڑی تنقیدیں کی ہیں رسالہ "دوام العیش فی الائمۃ من قریش" خلافت کے باطل اصولوں کی تردید میں معرکۃ الآراء تصنیف ہے کتاب کی تیسری فصل مولانا ابو الکلام آزاد

کے رسالہ "خلافت" کے مندرجات پر تنقید اور ان کی سیاسی اور قیاسی لغزشوں پر گرفت کے لیے خاص ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد بزعم خویش میدان سیاست کے شہ سوار اور بحر علم و ادب کے درآبدار تھے مگر امام احمد رضا کے نزدیک ان کا علمی مقام کیا تھا اس کا اندازہ درج ذیل عبارت سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ مولانا عبدالباری کو تو علماء میں شمار کرتے تھے۔ مگر مولانا ابوالکلام آزاد کو خاطر میں نہ لاتے تھے مولانا آزاد کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"کسی پرچۂ اخبار کی ایڈیٹری اور چیز ہے اور حدیث و فقہ کا سمجھنا اور، وہ من کا ترجمہ "سے" اور الیٰ کا ترجمہ "تک" کر لینے سے نہیں آتا۔" ۴۳

مولانا ابوالکلام آزاد کو اگر مذہب کا درک ہوتا تو سیاست میں وہ اس درجہ نہ بہکتے اور زبان و قلم سے وہی کہتے جو قرآن و حدیث کے مطابق ہوتا ان کے اسی علمی سطحیت کے پیش نظر امام احمد رضا انہیں "مسٹر" کہا کرتے تھے اس سلسلہ میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ممکن ہوگا جب مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح امام احمد رضا کی شخصیت کو پڑھا جائے اور ریسرچ و تحقیق کے لیے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو موضوع بنایا جائے۔

امام احمد رضا کا مولانا ابوالکلام آزاد سے کوئی موازنہ نہیں شاید اسی لیے انہوں نے کبھی کسی معاملے میں آزاد کو اپنے منہ نہ لگایا ان کے تلامذہ ہی مولانا آزاد کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے کافی تھے۔ چنانچہ جمعیت العلماء کانفرنس بریلی جس کا سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے اس کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر بریلی کی سرزمین پر ایک ہنگامہ تھا ۱۲ / ۱۳ / ۱۴ / رجب ۱۳۳۹ھ / ۲۲ / ۲۳ / ۲۴ / مارچ ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد کی صدارت میں بریلی کی سرزمین پر منعقد ہونے والی کانفرنس کو اہل بریلی کبھی فراموش نہیں کر سکتے اس کانفرنس میں جماعت رضائے مصطفےٰ کے کارکنان بھی شریک ہوئے جس میں صدرالشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی، رئیس المتکلمین مولانا سید سلیمان اشرف اور حضرت مفتی مولانا محمد برہان الحق جبلپوری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مولانا سید سلیمان اشرف نے قیادت اور ترجمانی کے فرائض انجام دیئے

اس کانفرنس کے انعقاد کے کوئی ساڑھے سات ماہ بعد ۲۵ رصفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو امام احمد رضا کا اپنے محبوب حقیقی سے وصال ہوا۔ لیکن مولانا آزاد کے دست راست اور معتمد خاص عبدالرزاق ملیح آبادی نے فاضل بریلوی سے متعلق جو تاریخ اور واقعہ گڑھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔

"کلکتہ سے مولانا کے ساتھ بریلی میں بھی پہنچا رات کو اجلاس تھا۔ مگر شام ہی سے خبریں آنے لگیں کہ کانفرنس نہیں ہونے پائے گی احمد رضا خان تو بے شک مرحوم ہو چکے ہیں مگر ان کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خان تو موجود ہیں۔" [۴۴]

مولانا ابوالکلام آزاد کے معتمد خاص کا یہ بیان پڑھنے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ خط بھی پڑھیے جو انہوں نے کانفرنس کے دوران امام احمد رضا کی بارگاہ میں ارسال کیا تھا تاکہ امام احمد رضا کے موت و حیات کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

بریلی۔ ۱۳ رجب ۱۳۳۹ھ

بخدمت جناب مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی دام مجدہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

"مسئلہ تحفظ و صیانت خلافت اسلامیہ، ترک موالات و اعانت اعدائے محاربین اسلام وغیرہ مسائل حاضرہ کی نسبت جناب کے اختلافات مشہور ہیں۔

چونکہ جمعیت العلماء کا جلسہ یہاں منعقد ہو رہا ہے اور یہی مسائل اس میں زیر نظر و بیان ہیں اس لیے جناب کو توجہ دلاتا ہوں کہ رفع اختلافات اور مذاکرہ و نظر کا یہ مناسب و بہتر موقع پیدا ہو گیا ہے جناب جلسہ میں تشریف لائیں اور ان مسائل کی نسبت بطریق اصحاب علم و فن گفت گو فرمائیں۔ میں ہر طرح عرض و گذارش کیلئے آمادہ و مستعد ہوں۔

فقیر ابوالکلام احمد کان اللہ لہ۔ [۴۵]

اب آپ انصاف سے بتائیں کہ ایسے مورخین جنہیں حقائق و معارف کا قطعاً علم نہ ہو اس

طرح کی بے سروپا باتیں لکھ مصنفین کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنا اور بلا وجہ اپنی اہمیت کسی کے سر تھوپنا کہاں کی دیانت ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی اس تحریر اور ان کے معتمد خاص ملیح آبادی کے مذکورہ بیان "احمد رضا خان تو بے شک مرحوم ہو چکے ہیں مگر ان کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خان تو موجود ہیں۔" کے تناظر میں تبصرہ کرتے ہوئے مولانا یٰسین اختر اعظمی رقمطراز ہیں۔

" زندہ درگور کرنا شاید اسی کو کہتے ہیں اور یہی وہ خدمات جلیلہ ہیں جن کے صلے میں ایسے مورخین کو تاریخ دانی بلند نظری اور روشن خیالی کے تمغہ جات پیش کیے جاتے ہیں جو یقیناً ایک المیہ سے کم نہیں اور اصحاب عدل و انصاف کی گردنیں اس پر شرم سے جھک جانی چاہئیں۔" ۴۶

مولانا ابوالکلام آزاد کی مفاقت میں اڑتیس سال گزارنے والے ذکر آزاد کے مصنف عبدالرزاق ملیح آبادی کی حقائق سے غفلت کی یہ ایک مثال ہے اس طرح اور بھی باتیں ہیں جن کا حقیقت اور واقعیت سے دور کا واسطہ نہیں مگر انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ انہیں اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

جمعیت العلماء کانفرنس بریلی میں ترک موالات کا مسئلہ موضوع بحث تھا اس مسئلہ سے متعلق مولانا آزاد متعدد مقامات پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تھے مگر اس کانفرنس میں علمائے اہلسنت کے درمیان جو انہیں ناکوں چنے چبانے پڑے وہ ناقابلِ بیان ہے جلسہ کا باضابطہ آغاز مولانا ابوالکلام آزاد کی افتتاحی تقریر سے ہوا جس میں انہوں نے فرمایا۔

" اس جلسہ میں ایسے دوست اور بھائی بھی موجود ہیں جو ہمارے مسلک سے متفق نہیں ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں نیک نیتی پر مبنی اختلاف خیال یقیناً امت مرحومہ کے لیے موجب رحمت ہے لہٰذا میں ان بھائیوں اور دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے خیالات اور وجوہ اختلاف پوری آزادی سے پیش کر کے ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیں۔" ۴۷

علمائے اہلسنت کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان اشرف نے اظہار

خیال فرمایا اور ایسی فصیح و بلیغ تقریر فرمائی کہ بقول عبدالرزاق ملیح آبادی۔

"رضا خانی جماعت کے ترجمان اور خطیب مولانا سید سلیمان اشرف تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے موصوف کی تقریر نے جو بہت لمبی تھی کانفرنس کو ہلا ڈالا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب اور کچھ کہنا ممکن نہیں۔"[۴۸]

مولانا سید سلیمان اشرف نے اپنی تقریر میں باطل کے پرخچے اڑا دیئے تحریک خلافت کے قائدین کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں ایسی دھواں دھار تقریر مولانا نے جو اس موقع سے کی شاید ہی کبھی کی ہو بقول حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی۔

"مجمع مولوی سید سلیمان اشرف کی تقریروں کو دل لگا کر سن رہا تھا لوگوں کو شکایت ہو رہی تھی کہ مولانا بلند آواز سے تقریریں کریں یہاں تک آواز اچھی طرح نہیں پہنچتی اللہ اکبر کے نعرے لگائے جاتے تھے۔"[۴۹]

الغرض جوشِ خطابت میں مولانا سید سلیمان اشرف نے ترک موالات سے متعلق جتنی بشبر عی قباحتیں تھیں سب انہوں نے مولانا آزاد کی صدارت میں منعقد ہونے والے اجلاس میں مولانا آزاد کے منہ پر کہہ ڈالیں اور ببانگ دہل یہ فرمایا۔

"یہ لوگ موالات کو حکم شریعت سمجھ کر نہیں مانتے ہیں یہ تو مسلمانوں کو اپنے موافق کرنے کے لیے آیتیں تلاوت کرتے ہیں مانتے تو ہیں گاندھی کا حکم سمجھ کر یہی وجہ ہے کہ ترک موالات کے ساتھ ہنود سے موالات فرض سمجھتے ہیں آج تمام ہندوستان جانتا ہے کہ خلافت کمیٹی صرف ترک موالات بتاتی ہے اور ہنود سے موالات نہ تنہا موالات بلکہ ان کی رضا میں فنا ہو جانا ضروری قرار دیتی ہے۔"[۵۰]

مولانا سید سلیمان اشرف کے انداز خطابت نے لوگوں کو اس درجہ متاثر کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسا شعلہ بار مقرر بھی دم بخود رہ گیا آزاد نے بڑے جوش و ولولے کے ساتھ اپنی تقریر کا آغاز کیا بقول ان کے معتمد خاص عبدالرزاق ملیح آبادی۔

"اب سمندر میں طوفان آنا شروع ہو گئے آتش فشاں پہاڑ پھٹنے لگے زلزلوں نے

زمین کو الٹ پلٹ کر ڈالا۔ ستارے ششدر رہ گئے۔ چاند بھی انسانی طلاقت لسانی پر مبہوت ہو کر رہ گیا۔[۵۱]

مگر ملیح آبادی کے اس تاثر کے برخلاف مولانا نعیم الدین مراد آبادی کا تاثر بالکل برعکس ہے وہ فرماتے ہیں۔

"جس وقت ابوالکلام تقریر فرما رہے تھے میں ان کے برابر بیٹھا تھا میں دیکھ رہا تھا کہ ان کا بدن بید کی طرح لرز رہا ہے یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس مقابلہ کا اثر تھا یا ان کی عادت ہی ہے"[۵۲]

بہر حال بریلی کی جمعیت کانفرنس اس لیے بڑی یادگار کانفرنس تھی کہ وہاں آزاد کو بڑے دشوار گذار مراحل سے دوچار ہونا پڑا ہے ایک تاجر جو ابوالکلام آزاد کے ساتھ شریک سفر تھا اس کا بیان ہے کہ

"ابوالکلام جس وقت بریلی سے جا رہے تھے میں ان کے ساتھ تھا وہ یہ کہتے جاتے تھے کہ ان (علمائے اہلسنت) کے جس قدر اعتراض ہیں حقیقت میں سب درست ہیں ایسی غلطیاں کیوں کر کی جاتی ہیں جن کا جواب نہ ہو سکے اور ان کو اس طرح گرفت کا موقع ملے"[۵۳]

عبدالرزاق ملیح آبادی نے بریلی کانفرنس کی روداد "ذکر آزاد" میں بڑے گمراہ کن الفاظ میں بیان کی ہے لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر کے بعد

"مولانا سید سلیمان اشرف کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ مولانا آزاد کی تقریر نے ہمیں مطمئن کر دیا ہے اور اب ہم خلافت تحریک کے مخالف نہیں رہے مولانا حامد رضا خان بھی اٹھے اور صاف لفظوں میں فرمانے لگے سب غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں اب ہم سب کے ساتھ ہیں۔"[۵۴]

فاضل سوانح نگار کا یہ اتنا صریح جھوٹ ہے جس سے زبان ملوث کرنے میں کراہت ہو رہی ہے مگر ملیح آبادی اپنی اس کذب بیانی پر فخر کر رہے ہیں۔ دروغ گوئی جس کی عادت ثانیہ بن چکی ہو لوح و قلم کی پرورش کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کانفرنس کی روداد کا ہر لفظ از ابتدا

تا انتہا رمبنی بر تعصب ہے جس کتمانِ حق کے لیے "لعنۃ اللّٰہ علی الکذبین" سے انہوں نے دریغ نہ کیا واقعہ یہ ہے۔

• مولانا حامد رضا خان نے ابوالکلام آزاد سے فرمایا آپ توبہ کیجئے انہوں نے کہا کہ کس چیز سے، تو آپ نے فرمایا اپنے کفریات سے۔ یہ سن کر وہ بھوچکارہ گئے...

ایک طرف سے مولانا برہان میاں اعتراض کرتے ہیں ایک طرف سے مولوی حسنین رضا خان صاحب الزام دیتے ہیں وہ (آزاد) سوائے قسمیں کھانے اور اپنے اوپر لعنت کرنے اور کچھ جواب ہی نہیں دے سکتے تھے، یہ تمام کارروائی کرکے مولانا حامد رضا خان صاحب نے ان سے دستخطی تحریر چاہی، انہوں (آزاد) نے روداد میں چھاپنے کا وعدہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک ہمارے ان ستر سوالات کے جواب نہ ملیں اور ہر شخص اپنے کفریات سے توبہ نہ کرے اس وقت تک ہماری آپ کی صلح نہیں۔" ۵۵

یہ تھا اصل واقعہ جسے ملیح آبادی نے حسب عادت توڑ مروڑ کر پیش کیا بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو، امام احمد رضا اور ان کے تلامذہ نے باطل کی شکست وریخت کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی اور خلاف شرع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بڑی سے بڑی طاقت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، جس کے سبب امام احمد رضا امت مسلمہ کی نظروں میں محبوب رہے ایک بڑی جماعت نے ان کے نظریات کی تائید اور مذہبی نقطۂ نظر کی تقلید کی، اکثر دانشوروں نے ان کی علمی عبقریت کو سراہا موافقین و معاندین سب نے یکساں طور پر ان کی فقہی بصیرت کو تسلیم کیا۔ ان کے نام اکیڈمیاں، انجمنیں، مدارس، تنظیمیں قائم ہوئیں۔ متعدد عبادت گاہوں کو بھی ان کے نام منسوب کیا گیا۔ ہندو پاک ہی نہیں بلکہ عالمی جامعات کے محققین و ریسرچ اسکالرز ان کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اکثر خانقاہوں میں ان کی متصوفانہ زندگی کے چرچے ہیں، جس قدر ان پر تحقیق ہوتی ہے اسی قدر ان کی علمی عبقریت کا پتا چلتا ہے۔ خدا جانے وہ کتنی خوبیوں کے مالک تھے۔ دنیا کے ہر گوشہ میں ان کی علمی عظمت کا اعتراف کرنے والے مل جائیں گے۔ اس کے برخلاف

مولانا ابوالکلام آزاد "امام الہند" بن کر برصغیر کی وسعتوں میں گم ہو گئے جب انہوں نے تقلید سے انحراف کیا آباؤ اجداد کے مسلک سے روگردانی کی تو بعد ممات ان کی تقلید کوئی کیونکر کرتا دنیا سے رخصت ہوتے ہی وہ تغافل اور بے اعتنائی کا شکار ہو گئے ان کے نام سے حکومت ہند نے مسلمانوں کی خوشنودی کے لیے اکیڈمیاں ضرور قائم کی ہیں مگر ان کے افکار عالیہ پر وہاں کتنا کام ہوتا ہے وہ اہلِ علم پر مخفی نہیں۔

حواشی و حوالے

۱۔ ہفت روزہ "چٹان" جلد ۱۸، شمارہ ۷، ص ۳۳، لاہور۔

۲۔ روزنامہ "جنگ" کراچی ص ۶، جنوری ۱۹۷۹ء، بحوالہ گناہ بے گناہی مؤلفہ پروفیسر مسعود احمد ص ۳۴۔

۳۔ ہفت روزہ "چٹان" جلد ۱۸ شمارہ ۷، ص ۳، لاہور۔

۴۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ ص ۱۴۰، دہلی ۱۹۵۸ء۔

۵۔ ذکر آزاد، عبدالرزاق ملیح آبادی ص ۱۲۱، کلکتہ ۱۹۶۰ء۔

۶۔ آزاد کی کہانی۔ ابوالکلام آزاد ص ۱۶۱، دہلی ۱۹۵۸ء۔

۷۔ آزاد کی کہانی۔ ابوالکلام آزاد ص ۳۶۱۔

۸۔ ہفت روزہ "الجمعیۃ" ص ۲، جنوری ۱۹۷۱ء۔

۹۔ ابوالکلام آزاد۔ احوال و آثار مصنفہ مسعود الحسن عثمانی ص ۵۷ لکھنؤ ۱۹۷۷ء۔

۱۰۔ الہلال۔ آزاد، ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء۔

۱۱۔ ہفت روزہ "چٹان" لاہور، ص ۲۸۔

۱۲۔ اخبار مشرق گورکھپور جلد ۱۵، ص ۱۳، جنوری ۱۹۲۱ء۔

۱۳۔ اشتہار منجانب یوسف کھرگ پوری مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۹۲۰ء الہ آباد۔

۱۴؎ دوامغ الحمیر۔ جماعت رضائے مصطفٰے، ص ۲۴، ۱۳۴۰ھ۔

۱۵؎ دوام العیش۔ امام احمد رضا، ص ۶۳، بریلی۔

۱۶؎ ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست۔ جلال الدین، ص ۸۰، لاہور۔

۱۷؎ گناہ بے گناہی۔ پروفیسر مسعود احمد، ص ۶۵۔

۱۸؎ کلمۃ الحق۔ معین الدین اجمیری دہلی ۱۹۲۱ء بحوالہ گناہ بے گناہی، ص ۴۴۔

۱۹؎ دوام العیش۔ امام احمد رضا، ص ۶۸۔

۲۰؎ خطبات آزاد۔ مالک رام، ص ۲۰۵، دہلی ۱۹۷۴ء۔

۲۱؎ تبرکات آزاد، غلام رسول مہر ص ۱۶۴، دہلی ۱۹۶۳ء۔

۲۲؎ انوار رضا، لاہور، ص ۴۹۰۔

۲۳؎ انوار رضا، ص ۴۷۳ لاہور ۱۳۹۷ھ

۲۴؎ المحجۃ الموتمنہ فی آیۃ الممتحنہ۔ امام احمد رضا حاشیہ ص ۲، بریلی ۱۳۳۹ء

۲۵؎ ایضاً " " ص ۵۔

۲۶؎ ایضاً " " ص ۵۔

۲۷؎ ایضاً " " حاشیہ ص ۳۔

۲۸؎ المجادلۃ۔ ۲۲۔

۲۹؎ ھود۔ ۱۱۳۔

۳۰؎ آل عمران۔ ۲۸۔

۳۱؎ المحجۃ الموتمنہ امام احمد رضا ص ۳۹۔

۳۲؎ معارف رضا، جلد ہفتم ص ۱۵۷، کراچی ۱۹۸۷ء۔

۳۳؎ التوبہ۔ ۳۶۔

۳۴؎ المحجۃ الموتمنہ۔ امام احمد رضا ص ۳۰۔

۳۵؎ گنجہائے گرانمایہ۔ رشید احمد صدیقی ص ۳۰، ۳۱، لاہور۔

۳۶ النور۔ سید سلیمان اشرف ص ۱۰۴، علی گڈھ ۱۹۲۱ء۔
۳۷ مجلہ امام احمد رضا کانفرنس کراچی ص ۳۷۔ ۱۹۹۰ء
۳۸ امام احمد رضا اور مولانا ابو الکلام آزاد کے افکار، سید جمال الدین، ص ۲۸، دہلی ۱۹۹۱ء
۳۹ دو قومی نظریہ کے حامی علماء اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ادارت خواجہ رضی حیدر و حاجی احمد مجاہد ص ۳۷، کراچی ۱۹۸۲ء۔
۴۰ الطاری الداری۔ امام احمد رضا، ص ۹۱، جلد ۳۔
۴۱ معارف رضا ص ۱۹۶، کراچی، ۱۹۸۹ء۔
۴۲ الطاری الداری۔ امام احمد رضا جلد ۳، ص ۹۵۔
۴۳ دوام العیش۔ امام احمد رضا، ص ۶۹۔
۴۴ ذکر آزاد۔ عبد الرزاق ملیح آباد، ص ۱۲۲۔
۴۵ مکاتیب ابو الکلام آزاد، ص ۱۶۳، کراچی، ۱۹۶۸ء۔
۴۶ امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات، مولانا یٰسین اختر اعظمی ص ۴۳۔
۴۷ ذکر آزاد۔ عبد الرزاق ملیح آبادی ص ۱۲۴۔
۴۸ ایضاً " " ص ۱۲۴۔
۴۹ دوامغ الحمیر، ص ۵۶۔
۵۰ ایضاً ص ۵۵۔
۵۱ ذکر آزاد، ملیح آبادی ص ۱۲۵۔
۵۲ دوامغ الحمیر ص ۵۶۔
۵۳ ایضاً ص ۵۷۔
۵۴ ذکر آزاد۔ ملیح آبادی ص ۱۲۵۔
۵۵ دوامغ الحمیر ص ۵۷۔

OOO

خانقاہی نظام کو جو قوت اور توانائی امام احمد رضا سے حاصل ہوئی
اُس کا اعتراف مصور فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے اِن الفاظ
میں کیا ہے :

اُن کے مخالف اعتراض کرتے ہیں کہ مولانا (امام احمد
رضا) کی تحریروں میں سختی بہت ہے اور بہت جلدی
دوسروں پر کُفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ مگر شاید اُن
لوگوں نے اسمٰعیل شہید اور ان کے حواریوں کی
دل آزار کتابیں نہیں پڑھیں جن کو سالہا سال صوفیائے
کرام برداشت کرتے رہے۔ ان کتابوں میں جیسی سخت
کلامی برتی گئی ہے اُس کے مقابلے میں جہاں تک
میرا خیال ہے مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اب تک
بہت کم لکھا ہے۔ جماعتِ صوفیہ علمی حیثیت سے موصوف
کو اپنا بہادر، صف شکن سیف اللہ سمجھتی ہے اور
انصاف یہ ہے کہ بالکل جائز سمجھتی ہے۔

(ہفت روزہ خطیب (دہلی) مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۱۵ء)